تاریخ کے بدلتے نظریات

ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس
۱۸- مزنگ روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = تاریخ کے بدلتے نظریات
مصنف = ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ، لاہور
فون: 7249218، 7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1997ء
قیمت = -/100 روپے

انتساب

انور کمال کے نام

ان کی محبت اور خلوص

میرے لیے باعث فخر ہے

ترتیب

تاثرات 7

حصہ اول

تاریخ کے بدلتے نظریات 11
تاریخ اور آمریت 1
مورخ اور تاریخ 22
تاریخ کے اسباق 27
تاریخ کا علم 30
تاریخ کی تعریف 34
تاریخ اور انسانی فطرت 38
تاریخ اور مافوق الفطرت قوتیں 40
تاریخ اور جانور 42
تاریخ اور سنہری دور 45
تاریخ، اقلیتیں اور معاشرہ 48
تاریخ اور ہجرت 51
تمام تاریخ ہم عصر تاریخ ہے 57
تاریخی حقائق خود بولتے ہیں 60
تاریخ اور فیصلہ 63
ہم عصر تاریخ لکھنا 66
تاریخ اور جنگ 70
قوموں کا عروج و زوال 74
تاریخ اور تسلسل 77
مذاہب کیوں بدلتے ہیں؟ 80
اسلامی تاریخ کیا ہے؟ 84

تاریخ اور قوموں کا ملاپ 88
تاریخ کا خاتمہ 92
مزدوروں کی تاریخ کیسے لکھی جائے؟ 95
تاریخ کا ادراک 100
یونیورسل تاریخ 105

حصہ دوم

سیکولرازم کیا ہے؟ 109
قوم پرستی کیا ہے؟ 118
پاکستان میں قومیتی مسئلے کا تجزیہ 128
تاریخ پاکستان' قدیم دور ایک تبصرہ 134

حصہ سوم

مزاحمتی ادب 14
جمہوریت اور ثقافت 153
روشن خیالی اور دانش ور 156
پاکستانی دانشور اور معاشرہ 161
فرانسیسی انقلاب' نقطہ ہائے نظر 164

تاثرات

تعلیم کا بنیادی مقصد ہوتا ہے کہ معاشرہ کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد دے یہ کام خصوصیت سے سماجی علوم کے ذریعہ کیا جاتا ہے کہ جو سیاسی سماجی اور ثقافتی مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اور پھر ذہنی طور پر معاشرہ کو باشعور بناتے ہیں تاکہ ان مسائل کو سمجھا جاسکے اور ان پر قابو پایا جاسکے۔

اگرچہ موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت ہے مگر اس کی پوری اہمیت اور فوائد سے اس وقت تک کوئی معاشرہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے جب تک کہ سماجی علوم کے ذریعہ معاشرہ کو ذہنی طور پر باشعور نہ بنایا جائے محض سائنس اور تکنیک سے معاشرہ کو جدید نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ اس وجہ سے آمرانہ طرز حکومت میں سماجی علوم کو پس ماندہ رکھا جاتا ہے اور زیادہ زور سائنس اور فنی علوم پر دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ذہنی طور پر باشعور نہ ہوں اور ان کے اقتدار کو چیلنج نہ کرسکیں۔

پاکستان میں اس وقت سماجی علوم انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے بڑھتے ہوئے مسائل کی بنیادوں کو نہ تو ہم سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ اس وقت جن سماجی مسائل سے دوچار ہے' ان مسائل کے حل کا شعور سماجی علوم اور خصوصیت سے تاریخ میں موجود ہے۔ اس لئے اگر ہماری تاریخ کو جدید خطوط پر لکھا جائے تو ہم بہت سے مسائل اور ان کی بنیادوں کی نشان دہی کرسکتے ہیں اور کسی مسئلہ کا حل اسی وقت ممکن ہے کہ جب اس کو پوری طرح سے سمجھا جائے۔ یہ مضامین معاشرہ کو باشعور بنانے کی طرف ایک قدم ہیں۔

روس اور مشرقی یورپ میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں ان کے رد عمل کے طور پر مغرب کے دانشوروں نے اس بات کا اعلان کردیا کہ یہ تبدیلیاں 'جمہوریت' 'لبرل ازم' اور سرمایہ

داروں کی رُخ کو ظاہر کرتی ہے اور سوشل ازم جو ایک نظام کی حیثیت سے ابھرا تھا اپنی توانائی کھو چکا اور اب اس میں مغربی روایات اور نظام سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ اب دنیائے تاریخ کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ تاریخی عمل تصادم کے نتیجہ میں جاری رہتا ہے' اور اس کی نشوونما کش مکش سے ہوتی ہے اور اب جب کہ یہ کش مکش اور تصادم ہی ختم ہو گیا تو تاریخ کے پاس محفوظ کرنے کے لئے بھی کچھ باقی نہیں بچا۔

مغربی نظریہ سے شاید اس مین کچھ سچائی ہو کیونکہ انہوں نے تو آبادیات کے دوران اور بعد میں اپنے جمہوری سیکولر اداروں کو جس طرح سے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا ہے اور ایک ویلفیئر ریاست کے قیام کے بعد عام آدمی کی زندگی میں جو سہولتیں مہیا کی ہیں ۔ اس کے بعد شاید ان کے معاشرہ میں طبقاتی جدوجہد یا انسانی حقوق کی جنگ کی زیادہ ضرورت نہ رہی ہو' مگر مسئلہ ایشیا' افریقہ اور لاطینی ممالک کا ہے کہ جو تو آبادیاتی نظام کے بعد بھی مغربی امپیریل ازم کی گرفت میں جکڑی ہوئی ہیں اور خود ان ملکوں میں طبقاتی تقسیم نے جو مراعاتی طبقے پیدا کئے ہیں وہ عوام کو مسلسل لوٹ کھسوٹ رہے ہیں اس لئے ہمارے ملکوں میں تصادم اور کش مکش کا خاتمہ نہیں ہوا۔ ہمارے پاس تو نہ جمہوریت ہے' نہ لبرل ازم' نہ سیکولر ازم اور نہ بنیادی حقوق کا تحفظ ۔ اس لئے تاریخ کا مغرب میں تو شاید خاتمہ ہو سکتا ہے اور اس کا عمل وہاں تو رک سکتا ہے مگر ہمارے ملکوں میں تو یہ عمل ابھی شروع ہونا ہے اور تاریخ کو بہت کچھ محفوظ کرنا ہے ۔

کیونکہ سوشلسٹ ملکوں کی حالیہ تبدیلیوں نے محروم پس ماندہ اور غریب ملکوں کو بہت کچھ سیکھنے کے مواقع دیئے ہیں سب سے اول سبق تو یہ ہے کہ انقلاب یا تبدیلی کے لئے ملک سے باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں' بلکہ یہ تبدیلی اندر سے لانے کی ضرورت ہے۔ ایک عرصہ تک ان ملکوں کی سوشلسٹ یا کیمونسٹ پارٹیاں روس کی جانب دیکھتی رہیں اور وہاں جو تبدیلیاں آئیں ان کی حمایت کرتی رہیں' اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے ملک اور عوام کے مفادات سے زیادہ روس کے مفادات کا دفاع کیا' اور اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ پارٹیاں اپنے

عوام سے کٹتی گئیں اور ان کی خواہشات بس یہ رہ گئیں کہ انہیں روس صحیح اور جائز پارٹی تسلیم کرے۔

یہ صورت حال ابھی بدلی نہیں ہے' آج بھی یہ پارٹیاں اسی شد و مد سے گلاس ناٹ اور پیرسٹرائیکا کی حمایت کر رہی ہیں کہ جیسے یہ اسٹالن کی پالیسیوں کی کرتی رہی ہیں۔ گوربا چوف کے آنے کے بعد ان پر یہ راز کھلا کہ سوشل ازم میں تبدیلی کی ضرورت تھی جب بھی کسی بھی معاشرہ میں کسی بھی نظریہ کو اس کی غیر ملکی بنیادوں پر تسلیم کیا جائے گا تو اس کے نتیجہ میں سوائے ذہنی غلامی کے اور کچھ نہ ہو گا۔۔ روس کے دانشوروں نے ہمارے ملک کے دانشوروں کو ہمیشہ حقارت سے اس لئے دیکھا کہ ہم نے ان کی طرف سے راہنمائی کی غرض سے دیکھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے ہمارے مفادات کے تحت اپنی پالیسیوں اور نظریات کو تبدیلی کیا ہو اور آج جب انہوں نے اپنی ضروریات اور اپنے مفادات کے تحت اپنا نظام بدلنا شروع کر دیا ہے تو ان کے سامنے غریب ملکوں کے مفادات نہیں۔ ہمیں تاریخی حقائق سے یہ سیکھ لینا چاہئے کہ جب بھی روس یا چین کے ریاستی مفادات کو ضرورت ہوئی انہوں نے ایشیا او افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کی پرواہ نہیں کی خود ہمارے ملک میں چین نے ہر حکومت کا ساتھ دیا چاہے وہ آمرانہ ہو یا بورژوا جمہوریت اور کبھی عوامی تحریکوں کی حمایت نہیں کی۔

اس لئے پاکستان کے دانشوروں کے لئے ایک سخت مرحلہ درپیش ہے کہ انہیں اس ملک کی جڑوں سے ایسے نظریات و افکار تشکیل دینے ہیں اور ایک ایسے نظام کا خاکہ پیش کرنا ہے کہ جس کا تعلق غیر ملکی نظریات سے نہ ہو اور جس میں اس ملک کے عوام کو ان کی بنیادی ضروریات و حقوق مل سکیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اپنی تاریخ' ثقافت' اور روایات سے استفادہ کی ضرورت ہے' اسے سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہاں تک کہ ہمیں اپنی اصطلاحات کی ضرورت ہے کہ جو عام لوگ سمجھ سکیں اور جن کے ذریعہ انہیں متحرک کیا جا سکے۔

کیونکہ ہم جیسے ملکوں کے لئے حالات تیزی سے خراب ہوتے جا رہے ہیں روس اور

سوشلسٹ ممالک مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں شامل ہونے کی تیاری کر رہے ہیں اور ان کے دانشور ہم غریب ملکوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ ہم سرمایہ داری، امپیریل ازم اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اپنے لئے برکت سمجھتے ہوئے قبول کر لیں - یہ اس کی تو تیاری نہیں کہ روس اور مغرب اب دونوں مل کر ہمارا استحصال کرنا چاہتے ہوں - اور اگر ایسا ہے تو ہمیں ایک طویل جدوجہد کے لئے تیار ہونے کی ضرورت ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو بھی یہ حقیقت ہے کہ مغربی اور امریکی امپیریل ازم اب بغیر کسی چیلنج کے رہ جائے گا اور پھر اس کا مکمل خطرہ ہے کہ وہ ہمارا استحصال اور ظالمانہ طریقے پر کرے گا - اب اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ روس یا اس کے ہمسایہ ملک ہمارے بچاؤ کے لئے نہیں آئیں گے ہمیں اپنا دفاع خود سے کرنا ہے اپنے ذرائع کی بنیاد پر اور اپنے نظریات کے زور پر -------- اور اگر اس میں ہم کمزور ثابت ہوتے ہیں تو ہمارا مستقبل بڑا تاریک اور بھیانک نظر آتا ہے -

ڈاکٹر مبارک علی

لاہور، دسمبر ۱۹۹۰ء

حصہ اول

تاریخ کے بدلتے ہوئے نظریات

انسان کا ماضی بڑا پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ اس میں واقعات کا انبار ہے انسان کی سرگرمیوں اور جدوجہد کی ڈرامائی تفصیلات ہیں' قوموں کے عروج و زوال ہیں' تہذیبوں کی زندگی اور موت کی داستانیں ہیں' دیو مالائی شخصیتوں سے لے کر مفکروں' سیاستدانوں اور سائنسدانوں کے افکار و نظریات ہیں' جب مورخ ان بکھرے ہوئے' منتشر اور پھیلے ہوئے واقعات کو سمیٹتا ہے' اور ان کو ترتیب دے کر تاریخ کی تشکیل کرتا ہے تو اس وقت واقعات کی ترتیب تاریخ کے مفہوم کو پیدا کرتی ہے' اور تاریخ کے اس مفہوم کو سمجھنے کے لئے مختلف نقطہ ہائے نظر پیدا ہوتے ہیں۔ اس اختلاف کا پیدا ہونا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ تاریخ کے عمل اور اس کی رفتار میں یکسانیت نہیں' بلکہ اختلافات ہیں۔ اور اس لئے تاریخ کو مختلف اور جداگانہ انداز و زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔

کچھ مفکرین تو تاریخ اور اس میں ہونے والے واقعات کو حادثاتی یا اتفاقی قرار دیتے ہیں اور اس لئے تاریخ میں کسی بھی مفہوم کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تاریخ میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں یہ واقعات ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آتے ہیں' ان میں کوئی ربط اور تسلسل نہیں ہے بلکہ ہر واقعہ اپنی جگہ ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ان واقعات میں جنگوں کا شور وغل ہے' سازشوں کے تانے بانے ہیں' سنہ اور تاریخوں کا گورکھ دھندا ہے' اور بے شمار ناموں کی پیچیدگیاں ہیں۔ اس لئے ان سب سے کچھ سیکھا نہیں جا سکتا ہے۔ تاریخ ایک بے معنی چیز ہے' واقعات ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ انسان کو ان پر کوئی قدرت نہیں اور نہ ان کے مطالعہ سے وہ کوئی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے تاریخ ایک بے معنی اور بے کار علم ہے'

لیکن تاریخ کے اس مایوسانہ نقطہ نظر کے برعکس مفکرین نے تاریخ کو کئی زاویوں اور جہتوں کے ذریعہ لکھا ہے' اور اس میں ہونے والے واقعات کے ذریعہ اس سے مفہوم پیدا کیا ہے' ان کے مطابق واقعات خود بخود نہیں ہوتے بلکہ ان کی تہہ میں انسانی ذہن کار

فرما ہوتا ہے۔ اس لئے واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو ان سے انسانی ارادوں، خواہشات اور محرومیوں کی نشان دہی ہوتی ہے' اور اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک واقعہ دوسرے واقعہ سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح ملا ہوا ہے' کوئی واقعہ اپنی جگہ مجرد نہیں' بلکہ اس کے پس منظر میں بہت سے عوامل ہوتے ہیں' ایک مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ واقعات کے عوامل کو سمجھے اور ان کے تسلسل کا جائزہ لے'

اس لئے کچھ مورخ وسیع و عریض تاریخی سرمایہ سے صرف سیاسی واقعات کو چن کر ان کی بنیاد پر تاریخی عمل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخ میں شاہی و حکمراں خاندانوں اور طبقوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے ان کی تاریخ کا مرکز بادشاہ کی ذات' دربار' قوانین' جنگیں اور انتظام سلطنت ہوتا ہے۔ یہ ایک خاکہ بنا کر کہ جس میں ان کی طبقاتی سوچ کارفرما ہوتی ہے۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کو جانچتے ہیں کہ ان میں کون اچھا تھا اور کون برا؟ ان کے بنائے ہوئے قوانین اور انتظام سلطنت سے فائدے ہوئے یا نقصانات؟ یہ صرف سیاسی واقعات کو تاریخی عمل میں تبدیلی کی وجہ قرار دیتے ہیں اور معاشرے میں ہونے والے دوسرے تمام واقعات اور عمل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک دوسرے نقطہ نظر میں تاریخ کو جغرافیائی حالات کے تحت دیکھا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ آب و ہوا اور جغرافیائی علاقے تاریخ کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیتے ہیں اور قوموں کی علیحدہ عادات و خصوصیات پیدا کر کے ان میں ایک خاص قسم کا کردار پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے ہر علاقہ کے لوگ اپنی عادات و خصائل کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہر قوم اپنی جغرافیائی خصوصیات کے تحت سیاسی و ثقافتی روایات و ادارے تخلیق کرتی ہے اور ان کا پورا عمل اور ان کے رجحانات انؐ کے علاقے کی آب و ہوا پر ہوتے ہیں۔

فرائڈ نے تاریخ کا جو نظریہ پیش کیا اس کے مطابق انسانی تاریخ اور سماج کے ادارے ہمارے لاشعور میں جو تضادات ہیں ان کو دبانے کے بعد وجود میں آتے ہیں۔ تہذیب اس وقت وجد میں آتی ہے جب ہم اپنی جنسی خواہشات اور شہوت کو' جو ہماری لاشعور میں ہے'

اسے دبائیں - کیونکہ لامحدود شہوانی جذبات قتل و غارت گری 'غیر اخلاقی جنسی تعلقات اور تشدد کی طرف لے جاتے ہیں اور ایسے معاشرے کوئی تہذیب پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتے - جب انسان ان جذبات پر قابو پاتا ہے تو اس وقت وہ اپنی توانائیوں کو تخلیقی کاموں کی طرف لگاتا ہے اور تہذیب کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے ' انسان ان خواہشات کو کس حد تک دباتا ہے - کتنی سختی سے دباتا ہے اور اس کے لئے کن طریقوں کو اختیار کرتا ہے اس سے تہذیب و ثقافت کا معیار مقرر ہوتا ہے اور اس سے آرٹ کی شکلیں وجود میں آتی ہیں -

تاریخ کو کچھ مفکرین نے فلسفیانہ طور پر جانچا اور پرکھا ' اس ضمن میں ان کی یہ کوشش تھی کہ تاریخ کو ایک اعلیٰ و ارفع مفہوم دیا جائے - اس لئے انھوں نے تاریخ کو وسیع پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ' اور انسانی تہذیبوں کا وسعت نظر سے مطالعہ کیا اس نقطہ نظر سے ہر تہذیب کا ایک سانچہ اور ڈھانچہ ہوتا ہے ' ہر تہذیب ایک زندہ چیز ہے اور وہ مختلف مرحلوں سے گذرتی ہے - والیٹر نے تریخی عمل کو میکانکی قرار دیا اور اس کی تشریح اس طرح کی کہ فطرت نے ہر مخلوق کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں 'مثلاً پرندہ گھونسلا بناتا ہے - ستارے اپنے متعین راستہ پر چلتے ہیں - اسی طرح سے دنیا میں تاریخی عمل میکانکی طور پر جاری ہے - چونکہ انسان معاشرے کے لئے پیدا ہوا ہے اس لئے وہ معاشرے کے خاکہ میں اپنی تکمیل کر سکتا ہے جو کہ فطرت نے اس کے لئے بنایا ہے - جو معاشرہ ایک بار مکمل ہو جاتا ہے وہ تقلید کے ہاتھوں زوال پذیر ہو جاتا ہے - جینئس کے لئے صرف ایک صدی ہوتی ہے اس کے بعد اس کا زوال ہو جاتا ہے - اس لئے تاریخ میں ترقی و تکمیل کے عہد ہوتے ہیں - معاشرہ اس میں اور دور وحشت کے درمیان چکر لگاتا رہتا ہے - اس لئے والیٹر یورپ کی تہذیب کے بارے میں پر امید نہیں ہے ' اس کے نظریہ کے مطابق وہ وقت آئے گا کہ جب وحشی لوگ اوپیرا کر رہے ہوں گے اور یورپی ریڈ انڈین رقص کی طرف لوٹ چکے ہوں گے -

تاریخ میں قوموں اور تہذیبوں کی اس گردش کو ابن خلدون ' اشپینگلر ' اور ٹائن

[illegible] نظریات کے تحت پیش کیا ہے۔ اشپنگلر نے بھی [illegible] کی طرح مغربی تہذیب کو زوال پذیر کہا ہے اور یہ پیشین گوئی کی ہے کہ ۲۳ صدی میں مغربی تہذیب مر جائے گی اور اس کی جگہ سلاوی (روسی) یا چینی تہذیب لے لے گی۔

مذہبی نقطۂ نظر سے چونکہ کائنات کے پیدا کرنے اور چلانے والا خدا یا دیوتا ہے۔ اس لئے تاریخی عمل اس کی مرضی و خواہش کے مطابق چلتا ہے۔ ان کے نزدیک پوری تاریخ خیر و شر کی تاریخ ہے۔ کہ جس میں بالآخر فتح خیر اور نیکی کی ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک طبقہ ان مذہبی وجودی مفکرین کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ خدا انسانی تاریخ کی تشکیل میں دخل تو نہیں دیتا' مگر انسان اور خدا کے درمیان جو تعلق ہے وہ تاریخ کی تشکیل میں مدد دیتا ہے۔

کیا شخصیتیں تاریخ ساز ہوتی ہیں؟ اس نقطۂ نظر کے حامی کہتے ہیں کہ حالات کو بنانا' انھیں تبدیل کرنا' وقت کی رفتار تیز کرنا یا روک دینا' تاریخ میں یہ سب کام شخصیتیں کرتی ہیں۔ عام انسان محض مقلد ہوتا ہے۔ اس میں سوچنے' فکر کرنے اور عمل کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اگر شخصیتیں نہ ہوں تو معاشرہ ایک جگہ منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ شخصیتیں خدا کی نمائندہ ہیں کہ جو اس کائنات کو چلاتی ہیں۔

شخصیتوں کے پہلو بہ پہلو ایک دوسرے نقطۂ نظر سے تاریخ کی تشکیل میں عظیم اقوام حصہ لیتی ہیں۔ جن اقوام میں بے پناہ صلاحیتیں اور توانائیں ہیں انھوں نے علوم و فنون میں ایجاد کر کے ترقی کی۔ تاریخ میں یہ پسندیدہ اور عظیم اقوام یونان اور یہودی ہیں جو کہ اپنے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں' اور تاریخ عالم میں صرف اپنے کردار کو ابھارتے ہیں۔

تاریخ اور انسانی فطرت کے تعلق اور رشتہ پر زور دیتے ہوئے یہ دلیل دی گئی کہ انسانی فطرت تاریخ کو بناتی ہے۔ کیونکہ واقعات کی تہہ میں انسان کی ضروریات اور اس کے جذبات ہوتے ہیں کہ جو انسان کو عمل پر مجبور کرتے ہیں۔ ان ہی کی مدد سے انسان اپنی تقدیر بناتا ہے۔ میکاولی نے انسان کی فطرت کے بارے میں کہا کہ وہ بنیادی طور پر برائی کی طرف

مائل ہے - انسان صرف اس وقت نیکی کرتا ہے کہ جب اس کی ضرورت ہوتی ہے - فطرتاً انسان بھوک ' لالچ ' اور طاقت کے لئے باعمل ہوتا ہے ' اس کے نزدیک چونکہ انسانی فطرت ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے اس لئے تاریخ کا کام یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کرے -

میکاولی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تاریخ کو ایک سیکولر نقطہ و نظر دیا - اس نے کہا کہ انسان کے وجود اور اس کی سرگرمیوں کو عملی حقائق کی روشنی میں جانچنا اور پرکھنا چاہئے نہ کہ مذہبی و اخلاقی اقدار کے پیمانے میں - اس نے تاریخ کو مذھب اور اخلاق سے آزاد کرایا - اور اس کے لئے سیکولر اور سائنسی بنیادیں فراہم کیں - بقول بیکن میکاولی نے بتایا کہ انسان کیا ہے ؟ بجائے اس کے کہ اسے کیا ہونا چاہئے -

مارکسی نقطہ و نظر سے تاریخی عمل میں ذرائع پیداوار ' پیداواری تعلقات اور طبقاتی کش مکش اہم کردار ادا کرتے ہیں - جب اس نقطہ و نظر سے تاریخ کا مطالعہ کیا گیا تو اس نے تاریخی مفہوم کو ایک نئی جہت دی - اس نقطہ نظر کے تحت یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ نظریات و افکار کی تخلیق میں کن طبقاتی مفادات کا کردار ہوتا ہے - مختلف تحریکیں کن حالات کے تحت پیدا ہوئیں ؟ اور ان کا فائدہ کن کو ہوا ؟ زمانہ غلامی میں کون سے قوانین بن رہے تھے ؟ اور زمانہ جاگیرداری کی ثقافت کن عناصر سے تشکیل پا رہی تھی ؟ اس کی مدد سے معاشرہ کی سیاسی و سماجی تاریخ کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں مدد ملتی ہے -

۱۹۳۰ء میں فرانس میں تاریخ کو سمجھنے کا ایک نیا نقطہ نظر ابھرا کہ جس میں جغرافیہ ' معاشیات ' سماجیات ' لسانیات ' اور تاریخ کو ہم آہنگ کیا جائے اور اس وسیع تناظر میں انسان اور معاشرہ کے ہر پہلو کا مکمل جائزہ لیا جائے - اس نقطہ نظر میں اس بات پر زور دیا گیا کہ انسان اور اس کے طبیعاتی ماحول میں جو رشتہ اور تعلق ہے اسے اجاگر کیا جائے اور اس مکتبہ فکر کے ایک ترجمان لوسین فیبرو نے کہا کہ ہمیں ایک ایسی تاریخ کی ضرورت ہے کہ جس میں سوہنی دھرتی کی خوشبو ہو ' جس میں دیہات ہو ' اور فصل کاٹنے کی محنت ہو تاریخ کے اس نظریہ نے شہر کے بجائے دیہات اور منتخب لوگوں کے بجائے عوام کو تاریخ کا مرکز بنا دیا -

تاریخ اور آمریت

چونکہ ایک آمر کے اقتدار کی بنیادیں جمہوری روایات اور اداروں پر نہیں ہوتیں - بلکہ وہ اپنی سیاسی طاقت کو تشدد اور فوجی قوت کی بنیادوں پر برقرار رکھتا ہے - اس لئے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایسے تمام واقعات اور حقائق کو چھپائے کہ جن کے ظاہر ہونے سے اس کی حکومت کو خطرہ لاحق ہو - اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح سے اس کی حکومت کی کمزوریاں لوگوں کے سامنے نہ آئیں' کیونکہ اس صورت میں مخالفوں کو حوصلہ ملتا ہے' اور وہ حکومت کے خلاف تحریک شروع کرتے ہیں اس لئے آمر ہمیشہ سے لوگوں کو یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کی حکومت مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے' اور وہ اس قابل ہے کہ ہر مخالفت کو سختی سے دبا سکتا ہے اس لئے لوگوں کو غلط اطلاعات فراہم کرنے کے لئے اور انہیں ذہنی طور پر اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے تاریخ کے مضمون کو خصوصیت سے استعمال کیا جاتا ہے -

تاریخ کے مضمون کو خصوصیت سے ان ملکوں میں بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جہاں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے اندر ایک کے بعد دوسرا آمر آتا ہے کیونکہ جو بھی آمر اقتدار میں ہوتا ہے اس کی سب سے بڑی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے' اس لئے ہر نیا آمر اپنے عہد میں اپنے نظریات کے مطابق تاریخ لکھواتا ہے' اور ہوتا یہ ہے کہ جب ایک آمر مرتا ہے یا اسے زبردستی اقتدار سے علیحدہ کیا جاتا ہے تو پھر نئی حکومت اس کے عہد کی تمام تاریخ کو ختم کر کے مورخوں کو ایک نئی تاریخ لکھنے پر مامور کرتی ہے اور اگر یہ نئی حکومت سیاسی طور پر آمر سے اختلافات رکھتی ہے تو مورخوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کے عہد کی خرابیوں اور کمزوریوں کو اجاگر کریں' اس مقصد کے لئے مورخوں کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ آمر کے دور کی بدعنوانیوں کے بارے میں کھل کر لکھیں - اس طرح سے ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی آمر اقتدار میں ہوتا ہے تو اسے مجاہد آزادی اور عظیم راہنما کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے اور جب وہ معزول ہو جاتا ہے یا مرجاتا

ہے تو اسی کو ہمارے مورخ ظالم، خون ریز، اور بدمعاش کہنے لگتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تاریخ کو اس طرح سے وقت کے ساتھ بدلا جاتا ہے " حقائق کو مسخ کیا جاتا ہے " اور واقعات کو حکمرانوں کی مرضی کے مطابق ڈھالا جاتا ہے تو تاریخ اپنی صداقت اور سچائی کو کھو دیتی ہے اور بحیثیت ایک علم کے اس کی کوئی عزت و وقار باقی نہیں رہتا۔

ان ملکوں میں کہ جہاں دور آمریت طویل ہو تو وہاں تو تاریخ اور بھی زیادہ مسائل سے دوچار ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں تاریخ کا صرف ایک ہی نقطہ نظر پڑھایا جاتا ہے اور اس بات کی قطعی اجازت نہیں ہوتی کہ تحقیق کے ذریعہ تاریخ کو دوسرے نقطہ ہائے نظر سے پڑھایا جائے صاحب۔ اقتدار کی خواہش کے مطابق تاریخی واقعات و حقائق کو تبدیل کر دیا جاتا ہے اور اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ حکومت کی کمزوریوں کے کوئی نشانات باقی نہ رہیں۔ تاکہ تاریخ میں آمر کی حکومت کو بہترین اور فلاحی ثابت کیا جاسکے اس سلسلہ میں جارج آرویل نے لکھا ہے کہ

" تاریخ ایک ایسے مسودے کی مانند ہے کہ جسے ضرورت کے مطابق صاف کر کے کئی بار لکھا جا سکتا ہے۔ تاریخ کو مطلق العنان حکومت کے زمانے میں اس کے مفادات کی روشنی میں ترتیب دیا جاتا ہے "

ایک آمرانہ دور حکومت میں تاریخ کبھی بھی معروضی نہیں رہ سکتی بلکہ ہر بار اسے آمر کی پسند ناپسند اور اس کی مرضی کے مطابق تبدیل کیا جاتا ہے۔ اور مورخوں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے کہ وہ اس کی حکومت کی خلاف کچھ لکھنے نہ پائیں نکیتا خروشیف نے مورخوں کے بارے میں کہا تھا کہ۔

مورخ خطرناک لوگ ہوتے ہیں اور یہ ہر چیز کو الٹ پلٹ دیتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کی نگرانی بڑی ضروری ہے۔"

تاریخ پر اپنا کنٹرول قائم کرنے کی غرض سے۔ آمرانہ دور حکومت میں ایسے تحقیقاتی ادارے قائم کئے جاتے ہیں کہ جہاں مورخوں کو اس انداز میں تربیت دی جائی کہ وہ حکومتی

نقطہ نظر کے مطابق تاریخ لکھیں۔ خصوصیت سے نصابی کتب کی تیاری میں حکومت بہت زیادہ دلچسپی لیتی ہے اور احتیاط کے ساتھ ایسا مواد تیار کیا جاتا ہے کہ جس سے طالب علموں کو صرف ایک ہی نقطہ نظر معلوم ہو اور دوسرے حقائق سے وہ بے خبر رہیں۔ پھر نصابی کتب میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ تاریخی معلومات کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے اور مکمل تاریخ کے بجائے صرف اتنی تاریخ پڑھائی جائے کہ جو حکومت کے مفادات کے لئے ضروری ہو۔

حکومت کے تحقیقی اداروں میں تحقیق صرف ان موضوعات پر ہوتی ہے کہ جو حکومت کی پالیسیوں کو جائز قرار دیں۔ ہمسایہ ملکوں کی تاریخ کو بھی نئے انداز سے لکھا جاتا ہے تاکہ ان سے حکومت کے تعلقات کو صحیح ثابت کیا جائے۔ خصوصیت کے ساتھ اس عہد میں جدید تاریخ کو سب سے زیادہ مسخ کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کا تعلق براہ راست آمرانہ حکومت کے مفادات سے ہوتا ہے۔

تاریخ کو مسخ کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ کہ جس کی نشان دہی جارج آرویل نے کی ہے وہ یہ کہ اہم حقائق کو یا واقعات کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیا جائے یا انہیں بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھا جائے

"جھوٹ کی سب سے زیادہ طاقت ور شکل یہ ہے کہ واقعہ کو بھلا دیا جائے" اس لئے سرکاری مورخ تاریخ کو لکھتے وقت چالاکی سے ایسے تمام واقعات کو لکھتے ہی نہیں ہیں کہ جن سے حکومت پر زد پڑتی ہو، اور یا اس قدر اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ان کا کوئی مطلب ہی نہ نکلے۔ اس کی سب سے اچھی مثال ہمارے ہاں بنگلہ دیش کی علیحدگی ہے، ہمارے مورخوں نے اس واقعہ کے بارے میں نہ تو کوئی تجزیہ کیا اور نہ ہی اس المیہ کو پوری تفصیل سے لکھا، صرف یہ کہہ دیا کہ

"بنگلہ دیش ایک آزاد ملک ہو گیا" اس سے واقعہ کے اندر جو پوری تاریخ چھپی ہے ہوئی وہ ظاہر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہماری تاریخوں میں اس واقعہ کی تفصیلات نہیں لکھی گئیں تو اسے بہت جلد بھلا دیا گیا اور اس لئے اس سے کوئی سبق بھی حاصل نہیں کیا

گیا۔

مطلق العنان حکومتوں میں تاریخ کے علم کی اس وجہ سے نشوونما نہیں ہو سکتی کہ اسے آزادی کے ساتھ واقعات کا تجزیہ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے اور ان حکومتوں میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسی تاریخی شہادتوں کو جو ان کے خلاف ہوں انہیں بالکل مٹا دیا جائے۔ اس لئے اگر کبھی حالات بدلیں' اور تاریخ کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت پیش آئے تو مورخوں کو نئے تاریخ کو ترتیب دینے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ کیونکہ سرکاری دستاویزات' اخبارات' رسالے اور سرکاری رپورٹوں میں صرف سرکاری نقطہ نظر ہوتا ہے اور سنسرشپ کے ذریعہ تمام تنقیدی اور مخالفانہ نظریات کو دبا دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرہ کی پوری اور مکمل تاریخ ترتیب نہیں دی جا سکتی ہے'

مطلق العنان حکومتوں میں تاریخ کو اس نقطہ نظر سے پرکھایا جاتا ہے کہ تاریخ کی تشکیل صرف بڑی شخصیتیں ہی کرتی ہیں۔ اس لئے لوگوں کو ذہنی طور پر اس کے لئے تیار کیا جاتا ہے کہ ان کی اپنی علیحدہ سے کوئی حیثیت نہیں اور وہ اس پر انحصار کریں کہ عظیم لوگ ان کی تقدیر بدلیں گے' جب ایک مرتبہ لوگ اس نظریہ کو تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر ان کا اپنا اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور وہ عظیم شخصیتوں کے تابع اور وفادار ہو جاتے ہیں اس طرح آمر معاشرہ میں خود کو عظیم اور سچا بنا کر پیش کرتے ہیں اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ لوگ نہ صرف ان کا احترام کریں بلکہ راہنمائی کے لئے ان کی طرف دیکھیں۔ اس مقصد کے لئے ہر آمر کی شخصیت کی باقاعدہ سے تشکیل دی جاتی ہے اور لوگوں میں اس کی قابلیت ذہانت اور اہلیت کے قصے مشہور کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اس میں مافوق الفطرت خوبیاں پیدا کر کے لوگوں میں رعب و دبدبہ پیدا کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان کا جو مشن نامکمل رہ گیا تھا۔ اس کی تکمیل یہ کر رہے ہیں۔

کسی بھی دور آمریت میں انقلاب کی تاریخ لکھنے کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی۔ کیونکہ اس عہد میں انقلاب کے تصور کو مثبت انداز میں نہیں لیا جاتا' بلکہ اس کے منفی پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے' انقلاب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے قانونی حکومت کا تختہ الٹا

گیا اور تمام مستحکم اداروں اور روایات کو توڑ کر سیاسی انتشار پیدا کیا گیا - اس وجہ سے انقلاب لوگوں کو استحکام نہیں دیتا بلکہ افراتفری پھیلاتا ہے اس طرح سے تاریخ کے ذریعہ جمہوریت سیکولرازم لبرل ازم' اور روشن خیالی کے افکار و نظریات کے خلاف تبلیغ کی جاتی ہے خاص طور سے مسلمان ملکوں میں اور کہا جاتا ہے کہ یہ تمام نظریات مغرب کی سازش ہیں کہ جو مذہب اور ثقافت کو ختم کرنے کے لئے تیار کئے گئے ہیں' اس لئے ان نظریات سے دور رہا جائے اور انہیں قبول کر کے اپنی تہذیب و تمدن کو خراب نہیں کیا جائے -

اسی طرح سے اس عہد میں جو تاریخ لکھی جاتی ہے اسے غدار اور وفادار کے آہنگ میں لکھا جاتا ہے' اس لئے جب ایک آمر اپنے مخالفین کے خلاف اقدامات کرتا ہے تو اسے اس بنیاد پر درست کہا جاتا ہے کہ وہ ریاست کے غدار تھے - اس کے برعکس جو لوگ کے آمر کی خدمت کرتے ہیں انہیں محب وطن اور وفادار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے --

اس عہد میں تاریخ میں وطن پرستی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کیونکہ جب یہ جذبات لوگوں میں پیدا ہو جائیں تو پھر لوگوں سے مسلسل قربانیوں کے لئے کہا جا سکتا ہے اور حب الوطنی کے جذبات کی شدت میں لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مصیبتوں' تکلیفوں اور اذیتوں کو بھول جائے اور آمر کی کھل کر حمایت کریں کیونکہ اسی کی واحد شخصیت اس طرح ابھر کر آتی ہے کہ جو ان کی حفاظت کر سکتی ہے -

پاکستان میں جس قسم کا سیاسی نظام رہا - اس میں تاریخ کا مضمون بری طرح سے متاثر ہوا - اول تو تاریخ کو نظریہ پاکستان کی آمریت کا سامنا کرنا پڑا اور نصابی کتب کو اس نظریہ کے تحت تیار کیا گیا - اس وجہ سے تاریخ میں اختلافی نقطہ ہائے نظر کو بالکل برداشت نہیں کیا گیا - اور دوسرے نوآبادیاتی نظام کے عہد کے جو کورسز تھے انہیں تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور تاریخ کے مضمون میں جو تبدیلیاں آئی ہیں یا جو نئی تحقیقات ہوئی ہیں ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور کسی نئی تحقیق کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی - اگرچہ ۱۹۷۰ء کی دھائی میں مرکزی حکومت نے تاریخ و ثقافت کی تحقیق کے لئے اسلام آباد میں ایک ادارہ قائم کیا - مگر اس میں نہ تو نئی تحقیق ہوئی اور نہ ہی تاریخ کا کوئی نیا نقطہ نظر پیدا ہوا - جب

کہ ہم اب بھی ہندوستان کی تاریخ کو ہندو مسلم کش مکش کے آہنگ میں بیان کر رہے ہیں اور اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ پاکستان کی تخلیق ایک نظریہ کی بنیاد پر ہوئی تھی' اس نقطہ نظر کی بنیاد پر آمروں کو ہمیشہ یہ مواقع ملتے رہے کہ وہ تمام جمہوری اور سیکولر تحریکوں کو غیر اسلامی اور غیر نظریاتی کہہ کر کچلتے رہیں۔

موجودہ صورت حال میں پاکستان میں تاریخ کا مضمون انتہائی کس مپرسی کے عالم میں ہے اور اس بات کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ اسے آمرانہ دور کے ماحول سے یا نظریاتی زنجیروں سے آزاد کرایا جائے۔ اس لئے ہمارے ملک میں چاہے جمہوریت ہو' یا آمریت' اس میں نظریاتی بندھن اس قدر مضبوط ہیں کہ ان سے نہ تو تاریخ آزاد ہوتی ہے اور نہ ہی ہمارے دوسرے افکار و نظریات' اور اس صورت میں کسی روشن خیال اور انقلابی نقطہ نظر کی تخلیق ناممکن ہے۔

اس وقت پاکستان میں تاریخ کا مضمون اپنی دلکشی اور اہمیت کو بالکل کھو چکا ہے۔ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تربیت شدہ مورخ ناپید ہو چکے ہیں اور اگر ایسی صورت حال جاری رہی تو آگے چل کر آنے والے آمروں کے لئے بھی مشکل ہو گا کہ وہ کسی مورخ کو پا سکیں کہ جو ان کی تاریخ لکھے۔ لیکن میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ شاید یہ اچھا ہی ہو کیونکہ مسخ شدہ تاریخ لکھنے سے تو بہتر ہے کہ تاریخ سرے سے لکھی ہی نہ جائے۔

مورخ اور تاریخ

تاریخ لکھنے کے لئے مورخ کا سب سے پہلا کام مواد جمع کرنا ہوتا ہے ' ایک مورخ اور سائنسدان میں فرق یہی ہے کہ سائنسدان کے پاس تجربہ کے لئے تمام مواد ہوتا ہے مگر مورخ کو ماضی کی تشکیل کے لئے اور پھر اس کے تجزیے کے لئے پہلے مواد کی ضرورت ہوتی ہے مواد اکٹھا کرنے کے بعد مورخ کو تاریخ لکھنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱) واقعات کو روایت کرنا (۲) ان کی تفصیل لکھنا (۳) اور ان کا تجزیہ کرنا۔

واقعات کو روایت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا وہ بے ترتیبی کی حالت میں ہے واقعات کا کوئی تسلسل اور ربط نظر نہیں آتا' اب مورخ کا کام یہ ہوتا ہے کہ اول وہ ان واقعات کے صحیح ہونے کا تعین کرے ' پھر انہیں ترتیب کے ساتھ سنہ وار بیان کرے ' تاریخ کو اس طرح سے ترتیب دینے سے واقعہ کی اہمیت ہو جاتی ہے' کیونکہ دیکھا جائے تو ایک واقعہ بذات خود کچھ نہیں ہوتا' لیکن جب واقعات کو ملا کر ان کی ایک زنجیر بنائی جائے تو اس سے نہ صرف تسلسل پیدا ہوتا ہے بلکہ یک مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے اور یہی مفہوم تاریخ کو معنویت اور افادیت دیتا ہے۔

اس کے بعد واقعات کی تفصیل انتہائی ضروری ہوتی ہے کہ واقعہ کا پس منظر کیا تھا؟ اس عمل میں شریک کار کون کون تھے؟ اور واقعہ کے بعد اس کے اثرات کیا ہوئے؟ یہ تفصیلات اور واقعہ کے ہر پہلو کا جائزہ ' تاریخی عمل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر واقعہ کی تفصیلات معلوم نہ ہوں تو نہ اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور نہ معاشرہ پر اس کے اثرات کو سمجھا جا سکتا ہے۔

روایت اور تفصیلات کے بعد مورخ کا کام ہوتا ہے کہ واقعہ کا تجزیہ کیا جائے ' اور یہ سوالات اٹھائے جائیں کہ واقعہ کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کے کیا نتائج نکلے؟ اور اس سے تاریخی عمل کس حد تک متاثر ہوا۔

ٹریولین نے تاریخ نویسی کے بنیادی اصول بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ مورخ کا کام ہے کہ سائنسی شہادت کی بنیادوں پر حقائق کو دریافت کرے' پھر تخیلاتی بنیادوں پر واقعات کی تاویل اور تفسیر کرے اور آخر میں ادبی بنیادوں پر واقعات کو بیان کرے۔

تاریخ میں واقعات کا ایک اژدہام ہوتا ہے۔ ایک فرد کی زندگی سے لے کر اجتماعی طور پر قوموں کی زندگی میں بحران آتے ہیں' حادثات ہوتے ہیں' اور ان سب کے اثرات سے زندگی کا عمل جاری رہتا ہے۔ اب مورخ کا کام یہ ہوتا ہے کہ ان واقعات میں سے ان واقعات کو چنتا ہے کہ جن سے معاشرہ میں تبدیلی آئی۔ یا جنھوں نے تاریخی عمل کو متاثر کیا' ان واقعات کو پھر وہ ترتیب دے کر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی تہہ تک جائے۔ صرف ان کے بیان پر اکتفا نہیں کرے۔ بلکہ ان کی حقیقت کو بھی دریافت کرے۔ حقیقت کو دریافت کرنے میں اسے منطقی استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کون سا بیان کیوں اور کیسے غلط ہے؟ کون سی شہادت کمزور ہے؟ اور کس دلیل پر کیوں کر اعتراض کیا جا سکتا ہے؟ ضروری ہے کہ مورخ واقعات کو اس طرح بیان کرے کہ مباحثہ پیدا ہو' اور قاری کا ذہن سوچنے پر مجبور ہو جائے۔

مورخ کو تاریخ لکھنے کے لئے بنیادی ماخذوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے' ان بنیادی ماخذوں میں دستاویزات' نجی و سرکاری کاغذات' اخبارات' رسالے' ڈائریاں' خطوط' خود نوشت سوانح حیات' اور معاصر کی تاریخیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ آثار قدیمہ کی دریافت کے وقت وہ تمام اشیاء جو انسان دریافت کرتا ہے وہ اس کی زندگی اور اجتماعی طور پر معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں مکان' شاہراہیں' قلعے' چرچ' مسجدیں' محلات' کتبات' لباس' زیورات' فرنیچر' تصاویر' نقشے' اور سکے شامل ہیں۔۔

ان بنیادی ماخذوں میں معاصر تاریخوں اور دستاویزات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ انھیں کی شہادت پر مورخ ماضی کی تشکیل کرتا ہے۔ ضروری یہ ہوتا ہے کہ مورخ ان شہادتوں کو من و عن تسلیم نہیں کرے۔ بلکہ ان کی صداقت کو چیلنج کر کے انھیں جانچے' پرکھے' اور تجزیہ کرے پھر واقعات کے تسلسل سے اندازہ لگائے کہ ان کے بیان

میں کتنا حصہ صحیح اور کتنا غلط ہے - ان کے تعصب اور پسند و ناپسند کو دیکھے ' اور یہ تجزیہ کرے کہ انھوں نے واقعات کو کس انداز سے لکھا ہے اور حقیقت میں اس کے کیا معنی نکلتے ہیں -

کسی بنیادی ماخذ اور دستاویز کے اصلی اور جعلی ہونے کا تعین ضروری ہے اسکے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ مسودہ جس کاغذ یا کھال پر لکھا ہے اس کا تعلق کس عہد اور زمانہ سے ہے - لکھائی کا مواد ' قلم ' سیاہی ' اور کتابت کو دیکھے ' اگر اس پر مہر ہے تو وہ کس قسم کی ہے - اگر ان میں لوگوں کے نام ہیں تو ان کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا ' یہ دیکھنا کہ سنہ اور تاریخ کو کس طرح سے لکھا ہے - اگر کوئی فرمان ہے ' تو اس کی ابتداء اور آخر کو دیکھنا ' کیونکہ فرمان کی خاص زبان ہوتی تھی جو استعمال کی جاتی تھی ' اور اس کے روایتی جملوں سے فرمان کی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے - ان فنی اصطلاحوں کی طرف توجہ دینا جو استعمال ہوئی ہیں ' کیونکہ اصطلاحوں کا تعلق ایجادات سے ہوتا ہے اور ان کا استعمال اسی وقت ہو گا جب کہ ایجادات معاشرہ میں رائج ہوں گی ' زبان ' محاورے ' اور مروجہ الفاظ کے ذریعہ بھی عہد کا تعین کیا جا سکتا ہے ' کیونکہ زبان وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے ' اور اس میں نئے محاورے آتے رہتے ہیں - اور پرانے محاوروں کے نئے معنی ہوتے رہتے ہیں - دستاویز اور مسودوں میں کتابت کی غلطیوں کی جانچ پڑتال کرنا - کیونکہ مسودوں کو نقل کرتے ہوئے عام طور سے کاتب غلطیاں کرتے تھے اور بعض اوقات اپنی جانب سے جملے گھٹا اور بڑھا بھی دیتے تھے - کسی مسودہ کی اصلیت اور اس کے صحیح عہد کا تعین اب کاربن ڈیٹنگ اور دوسرے کیمیائی تجزیوں کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے -

اگر مورخ بنیادی ماخذوں کے ترجمے استعمال کرے تو اس میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر ترجمہ میں غلطیاں ہو جاتی ہیں - اور اس سے بات کا پورا پورا مفہوم بدل جاتا ہے - اس کی مثال برصغیر کی تاریخ ہے کہ جس کے اکثر فارسی ماخذوں کے انگریزی میں ترجمے ہوئے - ان ترجموں میں جو غلطیاں ہوئیں - وہ آگے چل کر برصغیر ہندوستان کی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئیں - اس لئے مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصل

زبان میں ماخذ کو دیکھے اور اس کو استعمال کرے -

بنیادی ماخذوں کی شہادت تسلیم کرتے ہوئے مورخ کے لئے ضروری ہے کہ ان شہادتوں کا مختلف انداز میں تجزیہ کرے' مثلاً اگر بیانات چشم دید ہیں تو یہ دیکھا جائے کہ کیا یہ فوری طور پر قلم بند کئے گئے یا بعد میں لکھے گئے - کیونکہ واقعات کو اگر کچھ وقت گذرنے کے بعد لکھا جائے تو اس میں جزوی تفصیلات درج ہونے سے رہ سکتی ہیں - اور یادداشت کے کمزور ہونے سے واقعہ کو کسی انداز میں لکھا جا سکتا ہے -

ان بنیادی ماخذوں کی مدد سے جو تاریخ لکھی جاتی ہے' وہ ثانوی ماخذ کہلاتی ہے - مورخ کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جس موضوع پر کام کر رہا ہے اس کے بارے میں تمام بنیادی و ثانوی ماخذوں کا مطالعہ کر کے ان سے مواد حاصل کرے' اور پھر اپنے نتائج اس مواد سے اخذ کرے -

تاریخ کے علم کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے بار بار لکھا جائے' کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ ہر موضوع پر نئی نئی معلومات سامنے آتی ہیں' نئے مسودے دریافت ہوتے ہیں - پرانوں کی غلطیاں نکالی جاتی ہیں - نئے نظریات اور افکار واقعات سے واقعات کا تجزیہ کیا جاتا ہے - اس لئے تاریخ کو بار بار لکھنا اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ غلط معلومات اور فرسودہ نقطۂ نظر کو ختم کیا جاتا ہے' اور نئے خیالات و نظریات کی روشنی میں زمانہ اور وقت کے تقاضوں کے تحت تاریخ کو لکھا جاتا ہے تاکہ وہ معاشرہ کی ترقی میں حصہ لے سکے -

اکثر تاریخ کے سلسلہ میں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس کا کیا فائدہ ہے ؟ کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ماضی کی اقدار کو بری طرح سے پامال کیا جاتا ہے' پرانی غلطیوں کو دہرایا جاتا ہے' اس لئے اگر مورخ یہ سمجھتا ہے کہ تاریخ کے کچھ فائدے ہیں - تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق لکھے' اسی وقت یہ ایک فائدہ مند علم ہو سکتی ہے - مثلاً موجودہ زمانہ میں افراط زر ایک اہم مسئلہ ہے - تاریخ کے مطالعہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ ماضی میں کیوں اور کیسے پیدا ہوا ؟ اور اسے کیوں کر دور کیا گیا ؟ یا تاریخ کے

ذریعہ ہم یہ بھی سیکھ سکتے ہیں کہ دنیا میں آمرانہ حکومتوں کا کیا پتا؟ کیونکہ تمام آمرانہ طرز

حکومتوں میں معاشرے کے مسائل اور بحرانوں کو جذباتی طور پر پیش کیا جاتا ہے - اور لوگوں کی توجہ ہٹا کر ان میں چھپے ہوئے تعصبات کو ابھارا جاتا ہے - ان مسائل اور بحرانوں کا ذمہ دار مخالفین کو ٹھہرایا جاتا ہے' سابق حکومتوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے اور یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ تمام مسائل بہت جلد حل ہو جائیں گے - تاریخ کے طالب علم ان آمرانہ حکومتوں کے ڈھانچوں اور حربوں سے خوب واقف ہیں' اب مورخ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ تاریخ لکھتے ہوئے حال کے مسائل کا حل ماضی میں تلاش کرے - تاریخ کی ایسی تشکیل معاشرہ کو شعور و آگہی دیتی ہے -

تاریخ کے اسباق

انسان اس کائنات میں فطرت کا ایک حصہ ہے اور دوسری مخلوقوں کی طرح محض ایک مخلوق ہے۔ فطرت کے وسیع و عریض اور پیچیدہ نظام میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔ اس لئے انسان کی اہمیت فطرت سے زیادہ اس کی اپنی تشکیل دی ہوئی تاریخ میں ہے جو اسے کائنات کی دوسری مخلوقات سے برتر کرتی ہے۔ انسانی تاریخ اور فطرت کی تاریخ میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ انسان تاریخ خود بناتا ہے جب کہ فطرت کی تاریخ میں اس کا کوئی دخل نہیں۔

ہیگل نے کائنات میں انسانی عمل کے بارے میں کہا ہے کہ انسان میں فطرت نے محنت کو لازم کر دیا ہے۔ اس لئے انسان اپنی محنت کا مظہر ہے اور اس محنت کے نتیجہ میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اور تخلیق ہوتا ہے وہ تاریخ کی تشکیل کرتا ہے۔ تاریخ انسانی معاشرے کی اس لئے ایک ضرورت بن گئی ہے کہ یہ اس کے ماضی اور گزرے ہوئے زمانہ محفوظ رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سوال اہمیت کا حامل رہا ہے کہ کون سے واقعات کو تاریخ میں محفوظ رکھا جائے اور کن کو نظر انداز کر دیا جائے؟ اس انتخاب کا مسئلہ معاشرہ کے نظام اور اس کی ذہنی ترقی پر ہوتا ہے۔ اگر معاشرے میں بادشاہت و طبقاتی نظام ہے تو تاریخی واقعات انہیں کے گرد گھومتے ہیں جن ملکوں میں آمرانہ طرز حکومتیں ہوتی ہیں۔ وہاں اگر مزدوروں، طالب علموں، اور عوام کا قتل عام ہوتا ہے تو اس کا کوئی ذکر نہ اخبار میں ہوتا ہے اور نہ ذرائع ابلاغ عامہ میں اور اس طرح یہ واقعات تاریخ سے خارج کر دئے جاتے ہیں۔ اس لئے تاریخ میں واقعات کا انتخاب حکمران طبقے اپنی پسند اور مرضی سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ میں خاندان اور شخصیتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ واقعات یا حقائق کیا تھے؟ مورخوں نے انہیں کس طرح سے پیش کیا؟ اور انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ ان سوالوں کو اگر بغور دیکھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک درباری اور سرکاری

مورخ ان ہی واقعات کو منتخب کرتا ہے جو بادشاہ یا حکومت کے مفاد میں ہوتے ہیں اور ان

واقعات کو نظر انداز کر دیتا ہے جن کے بیان سے انہیں خطرہ ہوتا ہے۔ تاریخ پڑھتے ہوئے اگر ان کو ذہن میں رکھا جائے تو ہر دور اور عہد کی تاریخ کو بہتر طریقے پر سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ انسانی نفسیات، کردار، اور اس کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کرہ ارض پر جہاں انسان نے تاریخ کی تشکیل کی، یہ تاریخ اپنے اندر انسان کو سکھانے کا بے پایا علم رکھتی ہے۔ اس سے انسان شعور حاصل کرتا ہے، اپنی سوچ اور فکر تبدیل کرتا ہے اور سبق سیکھتا ہے

تاریخ کا سب سے اہم سبق یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز مستقل اور دائمی نہیں ہر چیز اور ہر عمل وقت کے ساتھ برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ میکاولی نے اس کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ نیکی بھی ایک انسانی عمل ہے اور چونکہ عمل وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اس لئے نیکی کا تصور بھی بدل جاتا ہے۔ مثلاً جاگیردارانہ دور میں ہر طبقہ کی نیکیاں اور اوصاف جدا جدا ہوتے تھے۔ حکمران طبقے کے لئے رعیت پرور، فیاض، سخی بہادر اور شجاع ہونا ضروری ہوا کرتا تھا۔ جب مزارعین اور غلاموں کے لئے وفادار، نمک حلال اور جانثار ہونا ان کی اچھائیاں تھیں عورتوں کے لئے باعصمت وعفت، حیادار، شوہر و بچوں کی خدمت گزار ہونا بڑی خوبی کی بات تھی۔

صنعتی دور میں مزدوروں کی نیکیاں اور اوصاف بدل گئے۔ ان کے لئے محنتی ہونا، ایماندار، کام کرنے والا، نظم وضبط کا پابند اور ایماندار ہونا ضروری ہو گیا جب کہ سرمایہ دار کے اوصاف بھی جاگیردار کے مقابلہ میں بدل گئے وہ کفایت شعار حساب کتاب کا پابند روپیہ پیسہ کی بچت کرنے والا اور فضول خرچی سے بچنے والا بن گیا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر دور میں حکمران طبقے ان اوصاف اور قدروں کو دائمی بنانے کی کوشش کرتے تھے جو ان کے لئے مفید ہوتی تھیں، مگر وقت کی تبدیلی کے ساتھ قدریں اور روایات بھی بدلتی رہیں۔ طبقاتی معاشرہ میں جہاں چند طبقوں کی برتری ہو وہاں اپنے سے کم تر لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور نرمی سے بات کرنا ہی ایک نیکی اور خوبی ہوتی ہے،

اور کسی مزارع یا کسان کے لئے یہ باعث فخر ہوتا ہے کہ اس کے زمیندار نے اس سے مسکرا کر اور ہنس کر بات کر لی۔ مگر وہ معاشرے جو اس دور سے گزر گئے اور جہاں ہر شخص کو معاشرے میں برابر کا مقام ملا ہوا ہے وہاں کسی کا خوش اخلاق ہونا یا نرمی سے بات کرنا کوئی خوبی یا نیکی نہیں

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ تشدد اور سختی کے ساتھ کسی بھی نظام کو زیادہ دیر تک باقی نہیں رکھا جا سکتا ہے، کیونکہ جس قدر تشدد ہو گا۔ اسی قدر اس کے خلاف مزاحمت ہو گی جتنی سزائیں سخت ہوں گی اس قدر ان کے خلاف نفرت بڑھے گی۔ اس لئے آمرانہ اور مطلق العنان حکومتیں اپنے تشدد اور سخت سزاؤں کے بوجھ تلے دب کر خود ہی مر جاتی ہیں

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جمہوری ادارے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں کیونکہ یہ انسان کی جبلت ہے کہ وہ مل جل کر رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اپنے مسائل کو مل جل کر حل کرے اس لئے ہندستان میں پنچائت کا نظام تمام نشیب فراز کے باوجود زندہ رہا کیونکہ اس میں لوگوں کی شرکت ہے۔ جو فیصلے جمہوری انداز میں کئے جاتے ہیں ان کے نتائج بھی صحت مند ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق لوگوں سے ہوتا ہے

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اخلاقی طور پر عوام حکمرانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ ان کی ضروریات محدود ہوتی ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ سکون اور آرام سے زندگی گزاریں۔ جب کہ حکمراں طبقے لالچی، خود غرض، ظالم اور جابر ہوتے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات پر ہر نیکی اور خوبی کو قربان کر دیتے ہیں۔

تاریخ کا علم

تاریخ کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا جائے تو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ وہ علم ہے کہ جس میں تہذیب اپنے ماضی کو بیان کرتی ہے یا تاریخ مرحلہ وار انسانی ذہن و شعوری ترقی کو واضح کرتی ہے اور انسانی تجربات کو بتاتی ہے۔

موجودہ دور میں تاریخ اور سماجی علوم میں آپس میں مقابلہ ہے کیونکہ سماجی علوم موجودہ دور اور وقت کے مسائل سے متعلق ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں اس لئے لوگ وہ پڑھنا اور جاننا چاہتے ہیں جو کہ ان کے موجودہ مسائل کے حل کو ڈھونڈ سکے۔ چونکہ تاریخ کا تعلق ماضی سے ہے اس لحاظ سے اسے حال سے غیر متعلق سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر تاریخ کو اس انداز سے لکھا جائے کہ بیان ماضی کا ہو اور تجزیہ حال کا تو اس صورت میں تاریخ کا تعلق موجودہ زمانہ سے ہو جائے گا اور اس کے مطالعہ میں دلچسپی بڑھ جائے گی۔

دیکھا جائے تو تاریخ ماضی اور حال کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ اس مکالمہ میں حال عملی طور پر زیادہ حصہ لیتا ہے۔ کیونکہ زمانہ حال میں مورخ ماضی کے واقعات بیان کر کے ان کے ان رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے جو اب تک محققین تک کو معلوم نہ تھے اور ماضی میں خود اس معاشرے کو بھی معلوم نہ تھے۔ اس لئے مورخ سب سے اہم کام یہ کرتا ہے کہ وہ تاریخ کی تشکیل کر کے ماضی اور حال کو آپس میں ملا دیتا ہے۔

ماضی کے واقعات کو یاد رکھنے اور انھیں محفوظ کرنے کا شوق تمام ہی تہذیبوں میں رہا ہے۔ وہ معاشرے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے وہ اپنی روایات کو زبانی یاد کر کے محفوظ رکھتے تھے، مگر وہ انہیں حصوں کو یاد رکھتے تھے جنھیں وہ ضروری سمجھتے تھے اور باقی کو فراموش کر دیتے تھے۔ اس طرح زبانی روایات تسلسل کو باقی رکھتی نہیں۔ اس کے برعکس تعلیم یافتہ معاشرے میں ثقافتی روایات برابر بڑھتی ہیں اور یہ بغیر حذف کئے یا فراموش کئے جمع ہوتی رہتی ہیں، پھر تاریخ انھیں جمع کر کے ایک مفہوم دیتی ہے۔

تاریخ سے دلچسپی اگرچہ مشرق اور مغرب دونوں جگہوں پر رہی، مگر اس کا ارتقاء

مختلف انداز سے ہوا - ہندوستان میں مذہبی خیالات کی وجہ سے تاریخ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی کیونکہ ان کے نزدیک دنیاوی معلومات توجہ کے قابل نہیں تھے اور روحانی ترقی زیادہ اہم تھی - برہمنوں کا یہ نظریہ کہ دنیا بہت قدیم اور زوال پذیر ہے - تمام اشیاء ناپائیدار ہیں ماخوق الفطرت قوتیں انسان کی تقدیر بناتی ہیں' اور انسان نروان کے لئے ایک چکر میں گردش کرتا رہتا ہے - ان نظریات نے تاریخی فکر اور نظریات کو ابھرنے نہیں دیا -

مشرق کی دوسری بڑی تہذیب چین کی تھی - یہاں پر اگرچہ شاہی خاندان کی تاریخ لکھی گئی' بادشاہوں کے حالات اور انتظام سلطنت کی تفصیلات محفوظ کی گئیں' مگر یہ سب واقعات کو محض سنہ وار بیان کرنے تک محدود رہا' اور تاریخ کو تین باتوں کے لئے استعمال کیا گیا -

۱- اخلاقیات ۲- تعلیم ۳- انتظامی ضروریات

اس طرح تعلیم اور اخلاقیات کو انتظامیہ سے ہم آہنگ کیا گیا اور نظریہ رہا کہ دنیا ایک چکر میں ہے اور ہر چیز گردش کے بعد دوبارہ اپنے مقام پر واپس آجائے گی - بادشاہ زمین اور آسمان کے درمیان ہم آہنگی قائم کئے ہوئے ہے - اس وجہ سے مورخوں کے لئے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ واقعات کا تجزیہ کر کے ان کی وجوہات بتائیں - اس نے تاریخی نظریات کو پیدا نہیں ہونے دیا - اس طرح چین اور ہندوستان جو دنیا کی بڑی تہذیبیں ہیں انھوں نے مذہبی خیالات اور سماجی ڈھانچہ کی وجہ سے تاریخی تحقیق کو نہیں ابھرنے دیا -

اس کے برعکس یونان میں تاریخ کا جو مفہوم پیدا ہوا - اس میں واقعات مافوق الفطرت یا الٰہی قوتوں کے تحت پیدا نہیں ہوتے تھے' بلکہ یہ واقعات خاص قوانین کا نتیجہ تھے اور ان کی وجوہات ہوتی تھیں - اس لئے ان واقعات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہوتی تھی' کیونکہ جب کسی چیز کی وجہ ہو تو اس صورت میں ذہن اسے جاننے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے سائنسی سوچ پیدا ہوتی ہے -

یورپ میں عہد وسطیٰ میں جب تک چرچ کا غلبہ رہا تاریخ مذہب کے زیر اثر رہی مگر تحریک نشاۃ ثانیہ اور اصلاح تحریک مذہب کے بعد تاریخ کے مفہوم میں تبدیلی آئی

خصوصیت سے رومانوی تحریک نے تاریخی فکر میں انقلابی تبدیلیاں کیں - اس تحریک کی فکری بنیاد انفرادی آزادی پر تھی اور ازادی کی اہمیت ان کے ہاں انتہائی اہم تھی -

فرانسیسی مورخ مشلے نے اس بات پر زور دیا کہ لوگوں کی حرکت سے تاریخ میں تبدیلیاں آتی ہیں - یہ لوگوں کا جذبہ تھا کہ انھوں نے ملکر بیسٹل کو فتح کر لیا اور فرانس کی تاریخ بدل ڈالی -

رومانوی تاریخ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے تخیل کی نشوونما کی اور تاریخی عمل میں زندگی اور توانائی کو دیکھا - ان کا رویہ ماضی کی طرف ہمدردانہ تھا اور وہ قدیم عہد کو وحشت بربریت کا زمانہ نہیں مانتے تھے - کولنگ وڈ نے روشن خیال دور کے مفکرین پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ کا دائرہ وسیع ہونا چاہئے اور ان پہلوؤں کو سامنے لانا چاہئے جنہیں ان لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا اور دور وحشت سمجھ کر قابل توجہ نہیں سمجھا تھا - جرمن مفکرین نے اس نقطہ نظر سے تاریخ پر کام کیا اور انھوں نے عہد وسطی پر تنقید کرنے کے بجائے اس کی تعریف کی - یہ کام انھوں نے اس طرح کیا کہ روشن خیال مفکرین جن روایات و اقدار کے پیمانوں سے انہیں کم تر سمجھ رہے تھے ' انھوں نے ان پیمانوں کو بدل دیا اور تاریخ کو وسعت دیدی - چنانچہ جرمنی میں تاریخیت کا مفہوم پیدا ہوا جس نے تاریخ کو سمجھنے میں مدد دی - ایک جرمن مفکر نے تاریخیت کے ارتقاء کو اس طرح سے بیان کیا ہے :-

۱- رومانوی تحریک کہ جس نے قدیم عہد اور قدیم لوگوں کی تاریخ سے دلچسپی پیدا کی اور کو آئیڈیل بنایا اور لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ ماضی کو کس طرح ایک جذبہ کے ساتھ دیکھا جائے اور اس کی تعریف کی جائے -

۲- پروٹسٹنٹ جرمنی میں تقوی کی تحریک جس کو تصوف نے ترقی دی اور یہ انسانی نفسیات پر اثر انداز ہوئی - اس نے انفرادی شعور کو بڑھایا اور ساتھ ہی میں مذہبی تجربات کو زندگی کے دوسرے معاملات سے ملایا اس کی وجہ سے ذہن نئے خیالات سننے کے لئے تیار ہو گیا یہاں تک کہ تقوی کے خلاف بھی -

۳- قدیم عہد کے آرٹ سے نفسیاتی تعلق پیدا ہوا
۴- اس نے انفرادیت کو تقویت دی-

جرمنی کے مشہور مورخ رانکے نے تاریخ کو ایک پیشہ بنادیا- اب تک تاریخ ادیبوں اور فلسفیوں کے لئے ایک مشغلہ تھی' اسکے بعد سے تاریخ کو پیشہ ور مورخ لکھنے لگے' اور تاریخ کو لکھنے کے لئے سائنسی بنیادوں پر قوانین ترتیب دیئے گئے' مواد کی چھان بین کے طریقے وضع کئے گئے- یونیورسٹیوں میں تاریخ کے شعبے قائم ہوئے- تاریخ کی انجمنیں بنیں- تاریخ کے تحقیقی و علمی رسائل نکلنا شروع ہوئے اور اس طرح تاریخ کا علم ایک سنجیدہ اور سائنسی علم بن گیا اور اس قابل ہوا کہ وہ ماضی و حال کے مسائل کا تجزیہ کر سکے-

تاریخ کی تعریف

تاریخ کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں - اس لئے اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ تاریخ کیا ہے ؟ تو اس کی جواب میں کئی تعریفیں ذہن میں آتی ہیں - ان ہی میں سے ایک تعریف یہ ہے کہ تاریخ اس عمل کی دریافت ہے کہ جس سے گزر کر آج کا انسان ایک مرحلہ پر کھڑا ہے - اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج ہم انسان اور اس کے تخلیق کردہ روایات و اقدار کو جس اسٹیج پر دیکھ رہے ہیں وہ ماضی میں تبدیلی کے عمل سے گزر کر یہاں تک آئی ہیں - اور اس تبدیلی کو زمانہ حال میں صاف اور واضح طریقہ سے دیکھا جا سکتا ہے تاریخی عمل کو تین طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے

ایک وہ عمل جو ہمیشہ ایک رہتا ہے ' اور ہر تبدیلی کی مخالفت کرتا ہے ' دوسرا وہ کہ جس میں تبدیلی آہستہ اور خاموشی کے ساتھ آتی ہے ' اور تیسرا وہ کہ جس میں تبدیلی کی حیثیت انقلابی ہوتی ہے - ان تینوں کے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں - اور کسی معاشرہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے یہ دیکھا جائے کہ وہ کس عمل سے دوچار ہے -

ایک امریکی مورخ چارلس بیرڈ نے تاریخی عمل کے چار اصول بتائے ہیں -

۱- جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو ستارے چمکنا شروع ہو جاتے ہیں

۲- شہد کی مکھی جو پھولوں کا رس چوری کرتی ہے وہ شہد مہیا کرتی ہے

۳- خدا جسے تباہ کرنا چاہتا ہے وہ اسے پہلے پاگل بنا دیتا ہے

۴- خدا کی چکی آہستہ پیستی ہے مگر بہت باریک پیستی ہے

تاریخ کا اہم موضوع خود انسان کی ذات ہوتی ہے - اس چیز کی وضاحت کرتے ہوئے ولیم ڈل تھے نے کہا ہے کہ "انسان کی کوئی فطرت نہیں اس کے پاس جو کچھ ہے وہ تاریخ ہے" اور یہ تاریخ انسان کے نقطہ نظر سے فطرت اور ماحول کو دیکھتی ہے - اور اس کا مطالعہ کرتی ہے کہ انسان نے تاریخ میں کیوں اور کیسے فطرت کا مقابلہ کیا؟ سیاسی و معاشی اور سماجی ادارے کیسے بنائے ؟ اور تبدیلی کے اس عمل میں فطرت میں کیوں اور کیسے تبدیلیاں

آئیں ؟ کیونکہ تاریخ میں نہ صرف انسان خود کو بدلتا رہا بلکہ وہ اپنے ماحول کو ساتھ ساتھ تبدیل کرتا رہا- چونکہ انسان شعور رکھتا ہے اس لئے وہ اپنی تاریخ کو بیان کرتا ہے اور دوسری مخلوقوں کو بھی اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے- اور اس طرح فطرت اور جانوروں کی تاریخ بھی انسان کی تاریخ ہو جاتی ہے- اور اس نے فطرت کا جو استحصال کیا ہے وہ اس کے کارنامے بن جاتے ہیں-

اطالوی مفکر نے اس سلسلہ میں کہا کہ انسان فطرت کو نہیں سمجھ سکتا ہے کیونکہ فطرت کو اس نے نہیں بنایا ہے- مگر وہ اپنی تاریخ کو سمجھ سکتا ہے کیونکہ یہ تاریخ اس کی اپنی بنائی ہوئی ہے- اس میں اس کا ذہن- اس کی سرگرمیاں- اور اس کا عمل پوشیدہ ہے اور وہ اس راز پر سے آسانی سے پردہ اٹھا سکتا ہے اور اپنی عقل' دلیل' اور شعور کی مدد سے اسے بہتر طریقہ پر سمجھ سکتا ہے- اور پھر تاریخ کا تعلق صرف اس دنیا سے ہے اس سے آگے نہیں اس لئے انسان ان کو بخوبی جان سکتا ہے اور اس کو اپنی گرفت میں لا سکتا ہے-

تاریخ کی تشکیل کس طرح ہوتی چاہئے کہ وہ ماضی میں ہونے والے تاریخی عمل کو سمجھ سکے ؟ اس کے لئے کچھ مفکرین یہ کوشش کرتے ہیں کہ تاریخ کے قوانین دریافت کئے جائیں اور ان کی مدد سے تاریخی عمل اور اس کی رفتار و اثرات کا ادراک کیا جائے- مگر اس رد عمل میں کچھ مفکرین یہ کہتے ہیں کہ تاریخ کا یہ کام نہیں کہ وہ تاریخی عمل کو قوانین کی زنجیروں میں باندھ کر اس عمل کا یقین کرے- بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ تاریخ کی ان مختلف شکلوں کو اپنی گرفت میں لائے جو کہ وقت کے ساتھ پیدا ہوتی اور بدلتی رہتی ہیں- تاریخ کا ڈھانچہ کوئی آفاقی نہیں کہ جس کی تشکیل عقل یا مذہب کے ذریعہ کی گئی ہو- بلکہ تاریخ میں فرد کی سرگرمیاں- اور انسان کی کاروائیاں- اور ان کا دائرہ نہ صرف وسیع ہے بلکہ ان میں بوقلمونی بھی ہے اور اس میں مختلف متحرک دھوپ و چھاؤں والی تصویریں بھی ہیں- اور جب ان کی روشنی میں مختلف، تہذیبوں اور ثقافتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاریخ بڑی رنگین و دلکش نظر آتی ہے

دوسرے یہ کہ تاریخ میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک عہد کی اہمیت ہے اور دوسرے کی

نہیں - بلکہ اس میں ہر زمانہ اور ہر گزرا وقت اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے - جرمن مورخ

رانکے کے الفاظ میں ہر دور کی اپنی اہمیت ہوتی ہے - کچھ میں کم یا زیادہ نہیں - کیونکہ کچھ ادوار میں انقلاب کی تبدیلیوں کی تیاری ہوتی ہے - اور کچھ میں یہ کام مکمل ہوتے ہیں - بقول اس کے تاریخ کے ادوار کی خدا کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ہے -

تھیوسوڈائڈس کے مطابق تاریخ کی انسانی سماج میں اس لئے اہمیت ہے کہ اس میں اس کے تجربات ہیں اور تاریخ سے انسان اس لئے مستفید ہو سکتا ہے کہ ایک جیسے واقعات بار بار دہرائے جاتے ہیں - اس لئے پولی بیس نے کہا کہ ہمیں تاریخ سے جو علم حاصل ہوتا ہے یہ اس لئے کار آمد ہے کہ یہ ہماری قوت فیصلہ کو بڑھاتا ہے اور کوشش کر کے ہمیں صحیح راستہ پر لے جاتا ہے - اس لئے اگر تاریخ سے عمل راہنمائی کا عنصر نکال دیا جائے تو پھر تاریخ میں کچھ باقی نہیں بچتا - تاریخ کی اس اہمیت کے پیش نظر معاشرہ میں مورخوں کی حیثیت بڑھ گئی اور اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ضرورت کے تحت تاریخ کے مسخ کرنے کا کام لیا گیا بہت سے مورخوں نے تاریخ کے ذریعہ اخلاقی سبق سکھانے کی غرض سے اس کو بگاڑا اور اس سے اپنے مطلب کی باتیں نکالیں - حکمراں طبقوں نے تاریخ کو اس لئے مسخ کیا کہ اس کے ذریعہ سے اپنی حکومت کے جائز ہونے کو ثابت کریں اور اپنے خاندان کی عظمت و عزت کا قائم کریں - سیاسی پارٹیوں اور مذہبی جماعتوں نے اپنے نظریات کو مقبول بنانے کے لئے تاریخ کو بطور آلہ استعمال کیا -

اس رد عمل کے طور پر تاریخ کو ایک سائنس بنانے کی کوشش ہوئی تاکہ اسے کوئی اپنے مفادات کے لئے استعمال نہ کر سکے اور نہ تو اس میں فلسفیانہ موشگافیاں ہوں - نہ وعظ و اخلاقی سبق اور نہ تفریح بلکہ اس کا کام محض حقائق کو پیش کرنا ہو - جے - بری نے کہا کہ جب تک تاریخ آرٹ رہی اس میں سچائی اور پرکھ کے معیار سخت نہیں تھے - اس لئے تاریخ کو سائنس کے طور پر تشکیل دے کر حقائق کو جانچنے کا معیار سخت کرنا چاہئے - اس نظریہ کے رد عمل کے طور پر بور کھارڈٹ نے کہا کہ تاریخ سب سے زیادہ غیر سائنسی ہے - اسے نہ تو عقلی فلسفہ اور نہ تجرباتی سائنس کے دائرہ میں رکھا جا سکتا ہے -

اس کا مطلب یہ تھا کہ تاریخ میں اس قدر انواع و اقسام کے تجربات ہیں - اس کا اسقدر پھیلاؤ ہے اور اس میں اتنی وسعت ہے کہ اسے قوانین کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا - کوئی ایک نظام اس کی توضیح و تشریح نہیں کر سکتا - اس کی خوبصورتی ہی یہ ہے کہ اس کی تاویل اور تفسیر میں ہمیشہ جدت ہوتی ہے اور یہ بار بار بدلتی رہتی ہے -

تاریخ اور انسانی فطرت

ایک زمانہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسانی فطرت ایک نہ تبدیل ہونے والی چیز ہے اور یہ ہمیشہ ایک سی ہی رہتی ہے - اس خیال نے تاریخ کو سمجھنے میں بڑی رکاوٹ پیدا کی' کیونکہ جب انسانی فطرت بدلتی ہی نہیں تو اس صورت میں دنیا کے ہر خطے اور علاقے کی تاریخ ایک ہی ہو جاتی ہے - اور جب تاریخ بھی انسانی فطرت کی جگہ ناقابل تغیر ہے تو پھر ایسی تاریخ سے انسان کچھ سیکھ بھی نہیں سکتا اور تاریخ کا کوئی مفہوم بھی پیدا نہیں ہوتا - اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈیوڈ ہیوم نے کہا تھا کہ "تاریخ ہمیں کچھ بھی نئی اور غیر معمولی بات نہیں سکھاتی"

انسانی فطرت کے ناقابل تغیر تصور نے ایک عرصہ تک تاریخ کے عمل کو سمجھنے میں مشکلات پیدا کیں اور تاریخ کو ایک جامد اور ٹھہرا ہوا علم سمجھا گیا' اس کے تحت واقعات ایک جیسے حالات میں یکساں طور پر پیدا ہوتے ہیں ' لہٰذا ان واقعات کی وجہ سمجھنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا - اور یہ کہ واقعات کا سلسلہ جاری رہتا ہے مگر انسانی فطرت اپنی جگہ ٹھہری ہوئی رہتی ہے' یہ حالات و واقعات میں بدلتی نہیں ہے -

لیکن اب نفسیات کی جدید تحقیقات اور تاریخ کے وسیع مفہوم نے اس خیال کی تردید کر دی ہے - تاریخی عمل اور اسکی تبدیلیوں سے یہ ثابت ہوا کہ انسانی فطرت تبدیل ہونے والی چیز ہے اور اس کی اس تبدیلی کی وجہ ہی سے تاریخ بھی بدلتی رہتی ہے - اس لئے اب جتنا انسانی فطرت کو سمجھا جائے گا اس قدر تاریخ کا مفہوم بھی سمجھ میں آئے گا -

ایک فرانسیسی مورخ لوسین فیبورے نے اس بات پر زور دیا کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی اس کی صرف تاریخ ہوتی ہے - اس لئے اگر انسان کو پہچاننے یا جاننے کی کوشش کی جائے' تو یہ کام صرف تاریخ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے - اس لئے آج کے معاشرے میں مورخ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس کا کام یہ ہے کہ وہ تاریخ کے ذریعہ انسانی فطرت کی تبدیلیوں کو دیکھے ' اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں جو تاریخ تشکیل پاتی ہے

اس کے مفہوم کو سمجھے۔

اس نظریہ نے کہ انسانی فطرت بدلتی رہتی ہے اس سے انسانی اعمال، اخلاقی اقدار و روایات اور معاشرتی اداروں کو سمجھنے میں آسانی ہو گئی۔ وہ انسانی اعمال جو قدیم عہد میں انسان سے سرزد ہوتے ہیں، جدید دور میں احمقانہ معلوم ہوتے تھے۔ مگر اب ان کا مفہوم ہو گیا اور یہ بات ذہن میں آ گئی ہے کہ نیکی اور بدی کا تصور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے سچائی و حقیقت کوئی آفاقی اور ابدی صفات نہیں بلکہ تاریخی عمل کا حصہ ہوتی ہیں۔ روایات و اقدار انسانی ضروریات کے تحت تشکیل ہوتی ہیں۔ اور جب انسانی ضروریات بدلتی ہیں معاشرتی اقدار و روایات بھی بدل جاتی ہیں۔

ان نظریات کی وجہ سے روایات و اداروں کی تحقیق میں آسانی ہو گئی اور انسانی ذہن جو اپنے دور کے تعصبات اور تنگ نظری میں محدود تھا اب وہ اس سے آزاد ہو گیا اور ساتھ ہی نسلی برتری کے تمام بت ٹوٹ گئے۔ کیونکہ اب تہذیبوں تمدنوں اور قوموں کی تاریخ کو جانچنے کے جو پیمانے اور معیار مقرر ہوئے ہیں وہ محدود نہیں بلکہ وسیع ہیں۔ ہر قوم کی روایات و اقدار ایک مفہوم رکھتی ہیں وہ دوسری قوموں کو احمقانہ معلوم ہوں، مگر ان کی اہمیت و افادیت ہوتی ہیں کیونکہ ان کا ارتقاء ان کے اپنے خاص ماحول میں ہوتا ہے اس لئے تاریخ میں یکسانیت نہیں بلکہ بوقلمونی ہے، اور یہی انسانی فطرت ہے کہ یہ ہر علاقہ ہر نسل اور ہر قوم کی علیحدہ ہوتی ہے اور اس ذہنیت سے جو تاریخ بنتی ہے وہ دلچسپ اور رنگین ہوتی ہے۔

تاریخ کا مطالعہ اگر قوموں کی تبدیل ہوتی ہوئی انسانی فطرت کے مطابق کیا جائے تو یہ نقطۂ نظر قوموں کو آپس میں ملاتا ہے انھیں دور نہیں کرتا، اس سے محبت پیدا ہوتی ہے اور نفرت ختم ہوتی ہے۔

تاریخ اور مافوق الفطرت قوتیں

جب سے تاریخ مذہب کی گرفت سے نکلی ہے اور اس کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے اس نے ذہن کو مذہبی تعصبات اور توہم پرستی سے چھٹکارا دلانے میں مدد دی ہے۔ تاریخ میں اب تک بہت سی شخصیتوں کا مقام اس لئے اہم تھا کہ ان کے ارد گرد کرامتیں اور معجزے تھے جن میں ان کی اصلی اور تاریخی حقیقت چھپ گئی تھی۔ یہ باتیں ایک ایسی معاشرہ میں تو موثر ہو سکتی ہیں کہ جس کی ذہنی ترقی نہیں ہوئی تھی اور جس کے لئے فطرت ایک سربستہ راز کی مانند تھی اور انجانی دنیا کی پر اسراریت پر انھیں یقین تھا۔ جب بھی وہ کسی چیز کو عقلی اور سائنسی بنیادوں پر نہیں سمجھ پاتے تھے تو اسے مافوق الفطرت قوتوں سے منسوب کر دیتے تھے اور جب انسان ان قوتوں پر یقین کر لیتا تھا تو پھر اسے سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی' وہ واقعات کی وجوہات تلاش نہیں کرتا تھا بلکہ ان پر یقین کر لیتا تھا۔

انھیں بنیادوں پر انسانی معاشرہ میں شخصیتوں کا عروج ہوا۔ اور معاشرہ میں انھیں بڑائی کا مقام حاصل کرنے کے لئے معجزوں' کراماتوں' اور روحانی قوتوں کا سہارا لیا۔ جس کی وجہ سے ان کا ڈر' خوف' اور احترام پیدا ہوا۔

اس بات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان شخصیتوں کی تاریخی حیثیت کم ہو گئی اور انھوں نے تاریخ کو بنانے اور اسے تشکیل کرنے کے لئے جو کام کئے تھے وہ پس منظر میں چلے گئے اور ان کی اہمیت گھٹ گئی۔ ان کے سماجی و سیاسی و معاشی اثرات کو بھلا دیا گیا' اور یہ شخصیتیں انسانی درجہ سے بلند ہو کر مافوق الفطرت ہو گئیں اور اس طرح سے یہ انسانی کی پہونچ سے دور ہو گئیں' اور شخصیتوں کی جب تاریخی اہمیت کچھ نہیں رہی تو ان کے عمل اور کردار سے انسان کو کچھ سیکھنے کی بھی ضرورت نہیں رہی' انسان صرف انسان سے سیکھتا ہے' جو انسانی درجہ سے بلند ہوں ان کی صفات حاصل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ شخصیتیں مافوق الفطرت قوتوں میں گھر کر اپنی افادیت کھو بیٹھیں۔

تاریخ کا کام یہ ہے کہ تاریخی واقعات کی وجوہات تلاش کر کے ان کی سائنسی بنیادیں فراہم کرے اور مذہبی شخصیتوں کو معجزوں و کراماتوں اور مافوق الفطرت طاقتوں سے نکال کر انھیں تاریخی مقام دے - تاریخ کی ان عقلی بنیادوں کی فراہمی کے بعد ان مذہبی شخصیتوں کی مذہبی حیثیت کمزور ہو گئی کیونکہ مذہب اور عقائد کے ارد گرد گھری ہوئی ان کی شخصیت لوگوں کو ذہنی طور پر مغلوب رکھتی ہے - لوگ ان سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ روحانی طاقت کے مالک ہوتے ہیں - جب انھیں اس حیثیت سے نکال کر ان کی تاریخی شخصیت کا تعین کیا جائے گا تو ان کی اصل حقیقت لوگوں کے سامنے آئے گی اور انھیں بحیثیت انسان کے دیکھا اور پرکھا جائے گا، تو ان کے کارناموں کی انسانی حیثیت ہو گی - اور اس حیثیت سے لوگ ان کا احترام کریں گے -

تاریخ کے اس کام سے نہ صرف توہمات ختم ہوں گے بلکہ واقعات و شخصیتوں کو عقل اور دلیل کے پیمانوں پر پلا اور تولا جا سکے گا - فرانس کے مشہور مفکر رینان نے حضرت عیسٰی کے بارے میں کہا تھا کہ اگر آج حضرت عیسٰی کا اثر لوگوں میں ختم ہوا تو اس کی وجہ ان کے وہ کام ہوں گے کہ جن سے ابتدا میں لوگ ان سے متاثر ہوئے تھے مگر اب وہی کام جدید زمانہ میں مضحکہ خیز نظر آتے ہیں -

تاریخ اور جانور

انسانوں اور جانوروں میں رشتہ تاریخ کا قدیم ترین اور انتہائی قریبی ہے- شکاری دور میں یہ جانور اس کی غذائی ضروریات کو مکمل طور پر پورا کرتے تھے- جب اس نے زراعتی زندگی اختیار کی تو شکار کے ساتھ ساتھ انسان نے جانوروں کو سدھانا اور پالنا بھی شروع کر دیا- لیکن ہر جانور انسان کی خواہش کے مطابق نہ ہو سدھایا جا سکا اور نہ ہی وہ اس سے مانوس ہوا- انسانی فطرت بھی کیا چیز ہے کہ وہ جانور جو اس سے مانوس ہوئے اور اس کے پالتو بنے انھیں جانوروں کے ساتھ اس نے حقارت کا سلوک کیا- مثلاً کتا، گائے، بھینس، اونٹ وہ جانور ہیں کہ جنھوں نے مشقت کے کاموں سے لے کر اس کو غذا کی فراہمی تک میں مدد دی- مگر کتے کی وفاداری کا یہ صلہ ملا کہ اسے آج تک بطور گالی یاد کیا جاتا ہے- گائے کو سیدھا سمجھ کر اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے- بھینس کے آگے بین بجانا کا محاورہ اس کی حماقت کے لئے اور اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی اس کی کوڑ مغزی کے لئے ہے- مگر جن جانوروں نے انسان کی مزاحمت کی اور اس کے پالتو نہیں بنے ایسے جانوروں کے لئے انسان کے دل میں عزت و احترام ہے مثلاً شیر کی بہادری، چیتے کی چالاکی اور لومڑی کی عیاری وغیرہ-

جب تک انسان نے خود کو جانوروں کی طرح سمجھا اس وقت تک دونوں نے فطرت کی مادی سہولتوں سے مل جل کر فائدہ اٹھایا، مگر جب انسان نے ذہنی طور پر ترقی کی اور اس نے اوزار اور ہتھیار بنانا شروع کر دیئے تو اس سے اس کی قوت و طاقت میں اضافہ ہو گیا اور اب اس نے یہ کوشش کی کہ فطرت پر تن تنہا اس کی اجارہ داری ہو اور اگر جانور اس کی اس اجارہ داری میں خلل ڈالیں تو ان سے مقابلہ کر کے انھیں تباہ برباد کر دیا جائے- چنانچہ جب یہ جانور فصلوں کو نقصان پہنچاتے تو ان کے اس عمل کو انسان بطور جنگ لیتا اور پھر ان جانوروں کی تباہی کے درپے ہو جاتا- اس طرح اس کا رویہ ان جانوروں کی جانب سے بے رحمانہ اور پر تشدد ہوتا چلا گیا- اس کے علاوہ جانور زرعی دور میں بھی اس کی غذائی ضروریات کے لئے ضروری رہے-

سوائے ہندوستان کے جانوروں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ دنیا کی دوسری تہذیب میں نہیں ملتا۔ اہنسا کے فلسفہ کے تحت جانوروں کے جذبات کا خیال رکھا گیا، ان کے گوشت سے پرہیز کیا گیا۔ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا خیال کیا گیا۔ یہاں تک کہ جین مذہب کے ماننے والے ننگے پیر چلتے تھے اور ناک پر کپڑا باندھے رکھتے تھے کہ کیڑے اور جراثیم اس طرح مارے نہ جائیں، ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ لوگ جانوروں کے دانہ و پانی کا انتظام کرتے تھے چونٹیوں کے لئے آٹا ڈالا جاتا تھا۔ جانوروں کے ہسپتال کھولے ہوئے تھے جہاں ان کا علاج و معالجہ ہوا کرتا تھا۔ بہت سے انگریز سیاحوں نے اپنے مشاہدات میں لکھا ہے کہ جب یورپی لوگ جانوروں کا شکار کرنا چاہتے تھے تو ہندو انھیں روپیہ پیسہ دے کر شکار سے باز رکھتے تھے۔

ہندوستان میں جانوروں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ پیدا ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب ان کا معاشرہ زرعی طور پر ترقی کر گیا اور اناج، دودھ دہی کی وافر مقدار ان کی غذائی ضروریات کو پوری کرنے لگے تو اس صورت میں انھیں جانوروں کے گوشت کی زیادہ ضرورت نہیں رہی اور انھوں نے پالتو جانوروں کی افادیت کے پیش نظر انھیں زندہ رکھنا زیادہ ضروری سمجھا۔ گائے، بھینس، بکری وغیرہ دودھ کے لئے، گھوڑا، اونٹ، ہاتھی اور گدھا وغیرہ بار برداری کے لئے۔ مگر وہ معاشرے کہ جہاں زراعت غذائی ضروریات کو پورا نہیں کر سکی وہاں جانوروں کا گوشت ان کی ضرورت رہا۔

لیکن جیسے جیسے معاشرے ترقی کرتے رہے، ان کا ذہنی شعور بڑھتا رہا، آلات و اوزاروں کی وجہ سے زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوتا رہا، اس کے ساتھ جانوروں کے ساتھ ہمدردی بڑھتی رہی۔ یورپ میں جانوروں کے ساتھ رویہ میں اس وقت تبدیلی آئی جب وہاں سائنسی علوم میں ترقی ہوئی اور جانوروں کے مطالعہ کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ ان کے بھی احساسات ہوتے ہیں اور وہ بھی دکھ، درد اور خوشی کے جذبات رکھتے ہیں۔

اس رویہ میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوا جب یورپ میں انسانیت نوازوں کی تحریک شروع ہوئی اور انسان کو یہ احساس ہوا کہ بھوک سے انسان اور جانور برابر کے

[illegible]

جانوروں کی لڑائیاں بند کرائی جائیں ورنہ اب تک ہر بڑی تہذیب میں جانوروں کی خوں ریز لڑائیاں انسانوں کو لذت و مسرت دیتی تھیں - ان میں ہاتھیوں، اونٹوں، کتوں، مرغوں، اور دوسرے جانوروں کی لڑائیاں قابل ذکر ہیں -

جانوروں کو مزید بہتر مقام اس وقت ملا جب یورپ کا معاشرہ زراعتی دور سے صنعتی دور میں داخل ہوا - مشین کی ایجاد نے جہاں ایک طرف انسان کو مشقت سے نجات دلائی وہاں جانور بھی جو اب تک بار برداری کے کام آتے تھے وہ اس سے آزاد ہوئے - صنعتی دور میں متوسط طبقہ نے جہاں امراء کی دوسری مراعات کے خلاف احتجاج کیا وہاں اس نے شکار کے مشغلہ پر بھی اعتراضات کئے اور اسے ایک وحشیانہ کاروائی قرار دیا -

انیسویں صدی میں یورپ میں پالتو جانوروں کا شوق ہوا اور ساتھ ہی جانوروں کے تحفظ کی تحریکیں چلیں، اور اب تو اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ گوشت کا استعمال ترک کر کے صرف سبزیاں کھائی جائیں -

جانور انسان کی تنہائی میں اس کا ساتھی اور غم خوار ہوتا ہے اور انسان کو جانوروں کی صحبت سے خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے - اس لئے پالتو جانور کو اب خاندان کا ایک رکن سمجھا جاتا ہے - جانوروں کی قربت انسان میں محبت و شائستگی کو جنم دیتی ہے اور اس سے تشدد و جارحانہ جذبات کا خاتمہ ہوتا ہے - یہ انسان اور فطرت کے رشتہ کو مضبوط کرتی ہے -

جب سے انسان نے بڑے بڑے شہر بسائے ہیں وہ فطرت سے بالکل کٹ گیا ہے اور ساتھ ہی جانوروں سے بھی - اب جانوروں سے اپنا پرانا اور قدیم رشتہ رکھنے کی خاطر اس نے ہر شہر میں چڑیا گھر بنائے ہیں - تاکہ ان کے رشتے ٹوٹنے نہ پائیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے منسلک رہیں -

تاریخ اور سنہری دور

یہ تصور کہ زمانہ قدیم میں ایک ایسا دور گزر چکا ہے کہ جس میں انسان کو مکمل آزادی اور خوشی و مسرت تھی' ہر تہذیب و تمدن میں رہا ہے - مذہبی عقائد کی مدد سے اگر دیکھیں تو یہ دور وہ تھا کہ جب آدم بہشت میں تھے اور وہاں ہر قسم کے عیش و آرام سے لطف اندوز ہو رہے تھے یہاں تک کہ انہیں گناہ کی سرزمین بہشت سے نکالا گیا - اس وقت سے مذہبی انسان اس کھوئی ہوئی جنت کی تلاش میں ہے اور اس کا آرزو مند ہے -

مارکسی نقطہ و نظر سے ابتدائی کیونسٹ معاشرہ ایک مثالی معاشرہ تھا کہ جس میں کوئی طبقاتی تقسیم نہیں تھی اور لوگ اجتماعی زندگی گزار رہے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے' تاریخی عمل کے ساتھ ذرائع پیداوار اور پیداواری تعلقات بدلتے چلے گئے اور انسان دور غلامی و جاگیرداری اور سرمایہ داری کے دور میں داخل ہوتا چلا گیا - یہاں تک کہ اس کے بعد پھر جو کمیونسٹ دور آئے گا وہ اس کھوئی جنت کو دوبارہ سے حاصل کر لے گا -

کیا اس قسم کا کوئی سنہری دور تھا بھی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اگرچہ مشکل ہے - مگر دنیا کے مختلف تمدنوں اور مذہبی کتابوں میں اس سنہری دور کا تذکرہ ضرور آتا ہے مثلاً چین میں تاؤ مذہب کی کتابوں میں اس کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے -

جب عظیم تاؤ کا اثر تھا تو اس وقت تمام لوگ ایک تھے - صاحب صلاحیت اور قابل لوگوں کو راہنما بنایا جاتا تھا - لوگ دوسروں کے والدین کو اپنا والدین سمجھتے تھے اور دوسروں کے بچوں کو اپنے بچے - بوڑھے لوگوں کے لئے ان کی موت تک گزارے کا بندوبست کیا جاتا تھا - جو کام کرنے کے قابل تھے ان کو کام دیا جاتا تھا - نوجوانوں کو تعلیم مہیا کی جاتی تھی - بیواؤں' یتیموں اور معذوروں کے ساتھ ہمدردی کی جاتی تھی - ہر آدمی کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام دیا جاتا تھا - قیمتی چیزوں کو محفوظ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا - کوئی اپنی ذات کے لئے کام نہیں کرتا تھا - چور' ڈاکو اور غدار نا پید تھے اس لئے گھروں کے دروازے کھلے

[illegible] ختم ہوتا ہے اور اس کی جگہ تبدیلی آتی ہے۔ اس کے بارے میں ایسی تحریریں ہے کہ یہ دنیا خاندانی ورثہ بن گئی۔ اب لوگ صرف اپنے والدین اور بچوں سے محبت کرتے ہیں اور محض اپنی ذات کے لئے محنت و مشقت کرتے ہیں طاقت ور لوگ جائداد کی حفاظت میں قلعہ تعمیر کراتے ہیں اور پھر انہیں خندقوں کے ذریعے محفوظ کرتے ہیں اور اپنی جائداد اور مال کی حفاظت کے لئے فوجیں رکھتے ہیں ہندوؤں میں یہ سنہری دور ستیا یوگ یا سچائی کا عہد کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں نہ بیماری تھی نہ خواہشات لوگ نہ زیادہ محنت کرتے تھے اور نہ کپڑا بنتے تھے کیونکہ زمین انہیں آسانی سے سب کچھ دیدیتی تھے۔ لوگ پر امن، معصوم، سادہ اور نیک تھے۔ ہر آدمی ہزار برس تک زندہ رہتا تھا۔ اس کے بعد جو دور آیا وہ کالی یوگ یا تاریخی کا زمانہ کہلاتا ہے اس کے بعد سے انسان کی سرشت میں لالچ داخل ہوئی۔ زندگی کی مدت گھٹ گئی، جنگ، بیماری غربت اور بھوک نے انسان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

لیکن ہندوؤں میں ستیا یوگ اور کالی یوگ ایک کے بعد ایک کر کے آتے رہتے ہیں اور تاریک زمانہ ایک سیلاب کے آنے کے بعد ختم ہوگا اور پھر دوبارہ سے سنہری دور شروع ہو جائے گا۔ اور یہ ایک چکر ہے جو اس طرح سے جاری رہے گا۔ ہندوؤں میں یہ نظریہ موسموں کی تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اکتوبر کی فصل کے بعد سردی کا موسم جس میں غذا وافر ہوتی ہے اور لوگ صحت مند رہتے ہیں۔ پھر اس میں آہستہ آہستہ کمی آتی ہے اور بالآخر سخت محنت کے بعد زمین میں بیج بونا پڑتے ہیں یہاں تک کہ مون سون میں سیلاب آتے ہیں اور اس کے بعد ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے'

اٹھارویں صدی میں جب کہ یورپ کے دانشور اس وقت کے حالات سے سخت بیزار تھے تو اس کے رد عمل میں رومانوی تحریک شروع ہوئی کہ جس میں زمانہ حال کی گندگی سے تنگ آ کر ماضی کا ایک رومانوی تصور پیش کیا گیا اسی کے تحت انہوں نے قدیم زمانہ میں سنہری دور کی تلاش کی کہ جس میں انسان فطرت کے قریب تھا۔ اور اس کی زندگی میں انتہائی سادگی اور مسرت تھی۔ یہ دانشور زمانہ حال کے مسائل سے چھٹکارا پانے کا حل یہ

تلاش کرتے تھے کہ انسان دوبارہ سے فطرت سے اپنے رشتے مضبوط کرے اور خود کو اس میں ضم کر دے، کیونکہ اسی میں اسے مسرت اور سکون ملے گا۔

ہندوستان کے مشہور مورخ کو سمبی نے سنہری دور پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اب ان تک آثار قدیمہ کی دریافت سے قدیم انسان کے بارے میں جو کچھ پتہ چلا ہے اس میں کہیں سنہری دور کا تذکرہ یا آثار نہیں ملتے۔ انسان نے جانور کی زندگی سے لے کر اوزار و آلات ہتھیار بنانے کا سفر کیا۔ اور ان کی مدد سے اس نے فطرت اور اس زمین پر قابو پایا۔ انسان کی فطرت کے ساتھ جدوجہد اس قدر سخت اور جان لیوا تھی کہ انسان کی عمر بہت کم ہوا کرتی تھی تاریخی شواہد کی روشنی میں پتھر کا انسان ۴۰ سال سے زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا، ہاں یہ ضرور تھا کہ ابتدائی دور میں انسان مل جل کر اشتراک کی زندگی گزارتا تھا۔ اگر اس کے پاس ضرورت سے زیادہ ہوتا تھا تو وہ اس میں دوسروں کو شریک کر لیتا تھا۔ کیونکہ دوسری صورت میں غذا یا گوشت کے خراب ہونے کا خطرہ تھا۔ مگر اس دور کے انسان میں لالچ نہیں تھی اور وہ ضرورت سے زیادہ شکار نہیں کرتا تھا۔ اس سے زیادہ سنہری دور کی اور کوئی حقیقت نہیں

کو سمبی کے بقول یہ سنہری دور ماضی میں نہیں بلکہ مستقبل میں ہے اور اس کے حصول کے لئے انسان کو جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس لئے تاریخ کے خاتمہ پر ایک سنہری دور کی خوش خبری ہے کہ جس میں تمام برائیوں کا خاتمہ ہو گا اور انسان کو تمام دکھ، درد، اور اذیت سے نجات مل جائے گی۔

تاریخ اقلیتیں اور معاشرہ

کسی بھی معاشرہ میں اقلیت کی حیثیت بڑی کمزور اور نازک ہوتی ہے کیونکہ معاشرہ جب کبھی کسی بحران کا شکار ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری اقلیت پر ڈال کر ان کے خلاف فسادات کی شکل میں اپنے غصہ کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں قتل و غارت گری ہوتی ہے' لوٹ مار ہوتی ہے' اور مسائل پھر وہیں کے وہیں رہ جاتے ہیں۔ ان حالات میں اقلیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ سے سیکھتے ہوئے اپنے رجحانات اور عمل کو اس طرح سے تشکیل دے کہ وہ اکثریت کے ساتھ امن و امان کے ساتھ رہ سکے۔

کیونکہ کسی بھی اقلیت کو عدم تحفظ کا سب سے بڑا احساس ہوتا ہے' اس لئے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی طور پر خود کو تمام دباؤ سے محفوظ کرے۔ اس سلسلہ میں ان سے جو غلطی ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ کوشش کرتی ہے کہ حکومت کے اہم عہدوں پر قبضہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں وہ سازش اور جوڑ توڑ کے ذریعہ صرف اپنے لوگوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں' یہ تمام عمل انھیں اکثریت کی نظروں میں مشتبہہ بناتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اقلیت اس طرح کسی سازش کے ذریعہ انھیں اختیارات سے محروم کر رہی ہے۔ یہ انھیں اقلیت کے خلاف مہم چلانے کا جواز مہیا کرتی ہے۔ اور یہ مطالبہ شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اقلیت سے تعلق رکھنے والوں کو تمام اہم عہدوں سے محروم کر دیا جائے' کیونکہ ان کے اور اکثریت کے مفادات علیحدہ علیحدہ ہیں۔

اس طرح جب اقلیت معاشی طور پر صنعت و حرفت اور زراعت پر قابض ہو کر مالی وسائل پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے' تو ان کی معاشی خوش حالی اکثریت کی نظروں میں کھٹکنے لگتی ہے' کیونکہ اس صورت میں یہ استحصالی طبقہ کی صورت میں ابھرتی ہے' اور اکثریت کے محروم طبقے ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا طریقہ ہے کہ جس پر عمل کرتے ہوئے اقلیت' اکثریت کے پہلو بہ پہلو چل سکے اور اپنے لئے معاشرہ میں عزت و وقار حاصل کر

سکے؟ اس کا حل یہ ہے کہ اقلیت جس معاشرے میں بھی رہے وہ خود کو استحصالی طاقت میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ کرے - اور اس بات کی کوشش کرے کہ علم و ادب ' سائنس ' صنعت و حرفت ' اور سیاسیات میں معاشرہ کی ترقی میں اضافہ کرے - مثلاً اس کی مثال سندھ میں پارسیوں سے دی جا سکتی ہے کہ جنھوں نے فلاح عام اور لوگوں کی بہبود کے لئے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا - انھوں نے اسکول ' ہسپتال ' باغات ' کتب خانہ ' اور تفریحی مقامات بنوائے کہ جس سے ایک عام آدمی کو فائدہ ہوا ' اور اسی وجہ سے معاشرہ میں ان کے لئے عزت و وقار کا جذبہ پیدا ہوا -

اس کی دوسری مثال یہودیوں کی ہے کہ جنھوں نے بحیثیت اقلیت کے تاریخ سے بہت کچھ سیکھا اور ان کا عمل یہ رہا کہ جس معاشرہ میں وہ رہے ' وہاں اپنی انفرادیت کو بھی انھوں نے برقرار رکھا - مگر معاشرے کی ترقی میں انھوں نے بحیثیت سائنسداں ' ادیب و شاعر ' دانشور ' فلسفی اور صنعت کار و تاجر حصہ لے کر پوری تہذیب کو آگے بڑھایا - آج بھی امریکہ اور یورپ کے معاشروں میں ان کی عزت اس لئے ہے کہ وہ معاشرہ کی ترقی میں حصہ لے رہے ہیں ' اور جب وہ معاشرہ کو کچھ دیتے ہیں تو معاشرہ بھی مجبور ہوتا ہے کہ ان کی عزت کرے -

اس لئے اگر اقلیت یہ چاہے کہ لوگوں کا استحصال کرے اور اپنی معاشی حالت کو بہتر بنائے یا سازش کے ذریعہ حکومتی اداروں پر قبضہ کر کے خود کو مضبوط کرے تو یہ رجحان ہمیشہ فسادات کی طرف لے جائے گا - نسلی ' مذہبی اور فرقہ واریت کے فسادات اس کی پیداوار ہوتے ہیں لیکن اگر اقلیت عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے اور ان کی سماجی حالت کو بہتر بنائے ' اپنے علم اور شعور سے ان کی ذہنی سطح کو بلند کرے - اس صورت میں معاشرہ میں اس کا وقار بلند ہو گا -

اکثر اقلیتوں کا رجحان یہ بھی ہوتا ہے کہ خود کو معاشرہ سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے اور مجموعی طور پر پورے معاشرے کے بجائے صرف اپنے بارے میں سوچا جائے - اس رجحان کے زیر اثر یہ خود کو سمیٹ لیتی ہیں - اور علیحدہ سے اپنی بستیاں آباد کر کے اپنے

اسکول، ہسپتال، اور دوسرے فلاحی ادارے قائم کرلیتی ہیں - اس طرح سے معاشرہ

ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے اور اس کی سوچ بھی کئی خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے - یہ علیحدگی اور تقسیم معاشرہ کو کمزور کر دیتی ہے کیونکہ آج کی دنیا میں کہ جہاں ہر چیز سمٹ رہی ہے - کوئی خود کو علیحدہ کر کے ترقی نہیں کر سکتا ہے - اور اس کی حفاظتی دیواریں وباؤں، بیماریوں، اور جرائم کی لہروں کو روکنے میں ناکام ہو جاتی ہیں - اس کی مثال ایسی ہی کہ کوئی غلیظ اور گندے جوہڑ کے بیچ میں خود کو صاف ستھرا نہیں رکھ سکتا ہے -

اس لئے علیحدگی کے بجائے معاشرہ کے دھارے میں مل کر اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا چاہئے اور یہی وہ طریقہ ہے کہ جو اقلیتوں کو نہ صرف تحفظ دے گا بلکہ ان کی عظمت میں بھی اضافہ ہو گا -

تاریخ اور ہجرت

دنیا کی تاریخ میں قبائلوں ' قوموں ' جماعتوں اور مختلف افراد کی ہجرت عام رہی ہے - ہجرت کی وجوہات معاشی ' سماجی ' سیاسی اور مذہبی رہی ہیں - ایک عام فرد ہو یا جماعت یا قوم ' ان کی زندگی کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ وہ کس طرح سے حالات کو ساز گار بنا کر ان میں سکون و اطمینان اور مسرت کے ساتھ رہ سکیں اور اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کر سکیں - مگر تاریخ کا عمل اس قدر پیچیدہ ہے کہ انسان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی - فطری حادثات ' سے لے کر جنگ و جدل ' قتل و غارت گری ' اور حملوں نے انسان کو چین سے ایک جگہ نہیں بیٹھنے دیا اور وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ دربدر مارا مارا پھرتا رہا -

ہجرت کی اگر مذہبی وجوہات کو ڈھونڈا جائے تو تاریخ میں یہ ہوا ہے کہ جب بھی نئے مذہب کی تبلیغ شروع ہوئی یا نئے مذہبی فرقے پیدا ہوئے تو ان لوگوں کا اکثریت کے ساتھ رہنا مشکل ہو گیا کیونکہ نئے مذہب اور فرقے کے عقائد کے تحت وہ اکثریت سے کٹ جاتے تھے - اور اس طرح سے کٹ کر وہ اپنے ہم عقائد ساتھیوں کی ایک جماعت بنا لیتے تھے اور اس میں بند ہو کر خود کو اس قدر محدود کر لیتے تھے ہ شادی بیاہ اور سماجی تعلقات میں وہ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے تھے - اس وجہ سے اکثریت ان سے بدظن ہو جاتی تھی - اور ایک لحاظ سے وہ انھیں غدار تصور کرتے تھے کہ جنھوں نے انھیں چھوڑ کر اپنی برادری علیحدہ بنالی اور ان میں اپنی واپسی کے تمام راستے بند کر دیئے اب جتنا اکثریت کا رویہ جارحانہ ہوتا تھا اس قدر یہ اپنے خول میں چھپ جاتے تھے اور اپنے عقائد اور رسم و رواج میں سخت ہو جاتے تھے - اکثریت کا ظلم و تشدد اور ان کا ناقابل برداشت رویہ ان کو آپس میں متحد رکھتا تھا - اور جب حالات حد سے بڑھ جاتے تھے تو اس وقت یہ ہجرت کر کے ایک ایسی سرزمین میں چلے جاتے تھے کہ جہاں وہ اپنے عقائد کے سلسلہ میں آزاد ہوں - حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو اسی لئے مصر سے ہجرت کرا کے چلے تھے تاکہ وہ فرعون کے ظلم و ستم

سے محفوظ ہو جائیں - یہی حال ابتدائی دور میں عیسائیوں کا تھا جو چھپ کر مذہبی عبادات

کرتے تھے اور جب بھی انھیں جان کا خطرہ ہوتا تو وہ دوسری محفوظ جگہوں پر ہجرت کر کے چلے جاتے تھے - اسلام کے ابتدائی زمانے میں حبش اور مدینہ کی ہجرت کی وجوہات بھی یہی تھیں -

جب امریکہ کی دریافت ہوئی تو یہودیوں کے علاوہ عیسائیوں کے بہت سے فرقے کہ جن کے اعتقادات عیسائیت کے اکثریتی فرقوں سے مختلف تھے وہ ہجرت کر کے وہاں چلے گئے تاکہ وہاں علیحدہ رہ کر آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد کے تحت زندگی گذار سکیں - آج بھی امریکہ میں ایسے فرقے دور دراز کے علاقوں میں ترقی یافتہ دنیا سے کٹے ہوئے اپنے رسوم و رواج کے تحت رہ رہے ہیں -

اکثر یہ ہوتا تھا کہ مذہبی فرقے اکثریت کے ظلم و تشدد سے بچنے کے لئے پہاڑوں ' صحراؤں 'جنگلوں اور غیر آباد علاقوں کو پسند کرتے تھے کہ جہاں پر لوگوں کا پہونچنا مشکل ہو - راستے دشوار گذار ہوں ' زمینیں بنجر ہوں ' اور علاقہ اپنی زرخیزی کی وجہ سے حکومت و لوگوں کی نگاہ میں نہ ہو اس لئے حسن بن صباح نے اسماعیلیوں کے لئے قلعہ الموت پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا - اور یہی وجہ تھی کہ دروز فرقہ کے لوگ شام و لبنان کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوئے تھے -

ان دور دراز اور دشوار گذار علاقوں میں جانے کے بعد یہ مذہبی فرقے ایک لحاظ سے دنیا سے کٹ جاتے تھے اور اس محدود ماحول میں ان کے عقائد اور ان کے رسم و رواج میں شدت آجاتی تھی اس کا نقصان یہ ہوتا تھا کہ ایک طرف ان کی صلاحتیں اور ذہانت اس گھٹے ماحول میں رہ کر پروان نہیں چڑھتی تھی - اور دوسرے یہ کہ اکثریت ان لوگوں کی توانائی اور کام سے افادہ نہیں کرتی تھی اور اس طرح یہ ہجرت دونوں کی پس ماندگی کی وجہ بنتی تھی -

تاریخ میں ہجرت کی مختلف مثالیں ' اور اسی اختلاف کی وجہ سے ان کے اثرات بھی مختلف ہوئے مثلاً جب امریکہ ' آسٹریلیا ' نیوزی لینڈ ' دریافت ہوئے تو ان علاقوں میں ایک

بڑی تعداد یورپی اقوام کی ہجرت کر کے گئی- چونکہ یہ لوگ تعلیم اور فنی طور پر وہاں کے مقامی باشندوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے اس لئے انھوں نے ان کی زمینوں پر قبضہ کر کے ان کا قتل عام کیا اور جو بچ گئے وہ دور دراز کے علاقوں میں دھکیل دیئے گئے- بار بار کے اس عمل نے مقامی باشندوں کی آبادی کو کم کر دیا اور ساتھ ہی ان کی تمام 'تہذیب و ثقافت کا خاتمہ ہو گیا- یہاں تک کہ جب ان میں مزاحمت کے تمام آثار ختم ہو گئے تو انھیں محفوظ علاقوں میں منتقل کر دیا گیا-

یوں تو افریقہ میں بہت سے یورپی باشندوں نے ہجرت کی مگر خاص طور سے جنوبی افریقہ میں انھوں نے اس عمل کو دہرایا اور مقامی آبادی کو جنگ و قتل عام کے ذریعہ پیچھے دھکیل کر ان کی زمینوں پر قابض ہوتے رہے مگر یہاں پر امریکہ یا آسٹریلیا کے باشندوں کی طرح مقامی افریقی باشندوں میں مزاحمت ختم نہیں ہوئی بلکہ اس میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ شدت آئی اور سفید فام اقلیت کے خلاف ان کی تحریک بڑی طاقت ور ہے-

چونکہ امریکہ 'آسٹریلیا' نیوزی لینڈ میں یورپی مہاجرین کو وسیع علاقے مل گئے- اس لئے انھوں نے اپنی تہذیب و تمدن کو یہاں نہ صرف قائم کیا بلکہ اسے فروغ دیا' جو یادیں وہ اپنے وطن کی لے کر وہاں گئے تھے' ان یادوں کو انھوں نے برقرار رکھا' نئے آباد ہونے والے شہروں کے نام اپنے ملک کے شہروں پر رکھے' اس لئے آج امریکہ اور کنیڈا میں یورپ کا ہر شہر مل جاتا ہے- چاہے وہ لندن ہو یا ایتھنز یا پیرس' ان ملکوں میں ان مہاجروں نے یورپی ثقافت کو پھیلا کر اسے مقبول بنا دیا مگر اس کے باوجود آج بھی یہ لوگ اپنی جڑیں اپنے پرانے ملکوں میں ڈھونڈتے اور ان پر فخر کرتے نظر آتے ہیں-

ہجرت کی ایک مثال یہودیوں کی فلسطین آمد ہے- تاریخ میں یہودی ہمیشہ ہجرت کے عمل سے دوچار رہے- انھیں کبھی اسپین سے نکالا گیا تو کبھی انگلینڈ سے' کبھی روس میں ان کا قتل عام ہوا تو کبھی جرمنی اور فرانس میں ان پر تشدد ہوا- اس لئے جب یہ ہجرت کر کے فلسطین میں آنا شروع ہوئے تو اس وقت یورپی یہودی تعلیم اور فنی تکنیک میں عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے- اس لئے انھوں نے تشدد اور طاقت کے ذریعہ عرب فلسطینیوں کو ان

[illegible]

افریقہ کی طرح فلسطینیوں نے ان کی مزاحمت کی اور مکمل طور پر کبھی بھی ہتھیار نہیں ڈالے' اور وقت کے ساتھ ان کی مزاحمتی تحریک انتہائی طاقت ور ہو گئی ہے -

ہجرت کی ایک قسم جنوبی ہندوستان کے تامل باشندوں کی تھی جو معاشی ضروریات کے تحت سری لنکا جاتے رہے یہاں تک کہ ان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ وہاں پر آباد ہو گیا - جب تک یہ لوگ معاشی اور سیاسی طور پر پس ماندہ تھے ان میں اور سنہالیوں میں تضادات پیدا نہیں ہوئے - مگر جب ان کی سماجی حیثیت بڑھی تو یہ چھپے ہوئے تضادات سامنے آنے لگے اور بالآخر ایک خوں ریز تصادم کی شکل اختیار کر گئے - اس تصادم میں جنوبی ہندوستان کے تامل باشندوں کی ہمدردیاں سری لنکا کے تاملوں کے ساتھ ہیں -

ہجرت کی ایک شکل وہ تھی کہ جس میں لوگوں کو زبردستی غلام بنا کر دوسرے ملکوں میں لے جایا گیا یا بحیثیت مزدور کے انھیں یورپی نو آبادیات میں منتقل کیا گیا - ان میں افریقہ کے باشندے ہیں کہ جو امریکہ اور جزائر غرب الہند میں لے جائے گئے - اور آج بھی یہ تہذیبی طور پر کٹے ہوئے اپنی جڑوں کی تلاش میں ہیں - اس طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد کو افریقہ' جزائر غرب الہند اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں بطور مزدور منتقل کیا ہندوستانیوں کی یہ آبادیاں ان ملکوں میں آج بھی اپنی زبان' اور کلچر کو علیحدہ رکھے ہوئے ہیں - اور اس وجہ سے اب ان میں اور مقامی باشندوں میں تضادات بڑھ رہے ہیں -

جب مہاجرین کے خلاف اس قسم کے تضادات ابھرتے ہیں تو اس صورت میں وہ لوگ ایک بار پھر ہجرت کر کے یا تو اپنے وطن واپس جانے کا سوچتے ہیں یا پھر ایسے ملک میں جانا چاہتے ہیں کہ جہاں وہ محفوظ رہ سکیں - مثلاً یوگنڈا سے نکالے گئے بہت سے لوگ واپس ہندوستان و پاکستان چلے آئے یا دوبارہ سے ہجرت کر کے برطانیہ و دیگر یورپی ممالک میں آباد ہو گئے -

اس طرح آج یورپ اور امریکہ میں جو پاکستانی و ہندوستانی ہجرت کر کے چلے گئے

ہیں - وہاں سے وہ اب بھی تشخص کی تلاش میں اپنے آبائی ملکوں میں واپس آتے رہتے ہیں -

ہجرت کا عمل چاہے سیاسی وجوہات کی بنا پر ہو یا معاشی و مذہبی اور سماجی -- یہ عمل مہاجرین کی تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے - ایک مرتبہ اپنی سرزمین چھوڑ کر بے جڑ ہونے سے عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا ہے - جس نئے علاقہ میں جاکر یہ لوگ آباد ہوتے ہیں ان کے لئے وہاں کی زبان اور ثقافت کو اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے - کیونکہ خود کو ختم کر کے یا مٹا کے دوسرا روپ اختیار کرنا سہل اور آسان نہیں - اس عمل میں کئی نسلوں کو قربانی دینی پڑتی ہے - مثلاً امریکہ میں کہ جہاں سب ہی مہاجر ہیں آج بھی ان لوگوں کو جو انگریزی زبان نہیں بولتے، جب ہجرت کر کے جاتے ہیں تو وہاں پر لاتعداد مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے - زبان نہ جاننے کے سبب یہ معاشرہ سے کٹ کر صرف گھر کی چار دیواریوں تک محدود ہو جاتے ہیں اور جب ان کے بچے انگریزی سیکھ لیتے ہیں تو اپنے ماں باپ کو جاہل سمجھ کر انھیں اپنے سے کم تر سمجھنے لگتے ہیں - اس طرح پہلی نسل ہجرت کے عمل پر قربان ہو جاتی ہے یہاں تک کہ آنے والی کئی نسلیں اس کلچر کو آہستہ آہستہ اختیار کر کے اس میں ضم ہو جاتی ہیں - ایک عرصہ تک گھر کا کلچر اور معاشرہ کا کلچر ان کی ذات کو بانٹے رکھتا ہے -

وہ ملک کہ جہاں سے لوگ ہجرت کر کے جاتے ہیں اس کا معاشرہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے - مثلاً نازی جرمنی میں دانشوروں، اور سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد نے یورپ اور امریکہ میں ہجرت کی، اس کا اثر جرمنی پر یہ ہوا کہ ان کی یونیورسٹیاں قابل اور باصلاحیت لوگوں سے خالی ہو گئیں - دوسرے خود ہجرت کرنے والے متاثر ہوئے کیونکہ انھوں نے اپنے فن اور شعبہ کے بجائے روزی کے لئے دوسرے کام کئے اور اس طرح اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا - جرمنی کو جنگ کے بعد اس نقصان کو پورا کرنے میں ایک عرصہ لگا -

آج اس صورت حال سے تیسری دنیا کے ممالک دوچار ہیں کہ جب ان ملکوں کی سیاسی و معاشی حالات کی وجہ سے باصلاحیت لوگ ہجرت کر کے چلے جاتے ہیں تو یہ

معاشرے ذہنی و فطری طور پر پس ماندہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہی پس ماندگی انہیں اس پر
مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر شعبہ میں اور ہر منصوبہ بندی کے لئے غیر ملکی ماہرین پر بھروسہ کریں۔

تمام تاریخ ہم عصر تاریخ ہے

مشہور اطالوی مفکر کروچے نے تاریخ کے سلسلہ میں یہ بات کہی کہ ہم قدیم تاریخ کو زمانہ حال کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تاریخ کے ان پہلوؤں سے اور ادوار سے دلچسپی لیتے ہیں کہ جن کا تعلق ہمارے حال اور اس کے مسائل سے ہوتا ہے اور جو حال کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں - اس وجہ سے مختلف حالات میں تاریخ کے مختلف عہدوں سے دلچسپی رہی ہے اور ایک خاص ماحول اور خاص تقاضوں کے تحت تاریخ کے خاص خاص شعبوں اور پہلوؤں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان پر تحقیق ہوتی ہے - مثلاً عہد نشاۃ ثانیہ میں یونانی اور رومی کلچر سے دلچسپی پیدا ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عہد میں مصور' مجسمہ ساز' موسیقار' شاعر و ادیب اور موسیقار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہے تھے اور یورپ میں کلچر کے ان پہلوؤں پر دلچسپی بڑھ رہی تھی - لوگوں میں کلچر کے بارے میں ایک ذوق پیدا ہو رہا تھا اس لئے انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے سامنے تاریخ کا ایک ایسا عہد ہو کہ جس کلچر سے وہ سیکھ سکیں اور اس سے متاثر ہو سکیں - اور جو کچھ اس میں موجود ہے اس میں مزید اضافہ کر سکیں -

یونانی اور رومی کلچر کی بنیاد مذہبی نہیں سیکولر تھی - اور ان کے موضوعات میں بڑی وسعت تھی - نشاۃ ثانیہ کے فن کار و دانشور بھی مذہبی اثرات سے نکلنے کی جدوجہد کر رہے تھے - اگرچہ انھوں نے مذہبی موضوعات کو اختیار کیا مگر ان موضوعات کو سیکولر رنگ میں ڈھال دیا اور کوشش کی کہ ان کے ذریعہ فنی خوبیوں اور باریکیوں کا اظہار کریں -

جب اٹھارویں صدی میں رومانوی تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے زمانہ حال کی ترقی سے شدید بیزاری کا اظہار کیا - سیاسی نظام کی سازشوں' بادشاہ و امراء کی عیاشیوں' اور امیر و غریب کے فرق نے ان کو اپنے زمانہ سے نفرت دلا دی' اور ردعمل کے طور پر انھوں نے قدیم عہد کے انسان اور اس کی تاریخ میں دلچسپی لی کہ جب وہ فطرت سے جڑا ہوا تھا - اس کی زندگی میں سادگی تھی - نہ ریاست تھی - نہ قانون - اور انسانوں کے درمیانی بغیر غرض کے

تعلق و رشتہ تھا۔ رومانوی تحریک والوں کے لئے یہ قدیم دور، اور فطرت سے جڑا ہوا انسان محبوب بن گیا۔

جب اٹھارویں صدی میں یورپ میں یونان اور روم کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی تو اس کی وجہ بھی اس دور میں یورپی اقوام کی وہ سرگرمیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے افریقہ و ایشیاء میں اپنی نوآبادیات قائم کر رہے تھے اور یورپی کلچر کی برتری و افضلیت کے قائل ہو کر اسے دنیا میں پھیلانا چاہتے تھے۔ اس تحقیق کے ذریعہ انھوں نے یورپی کلچر کی جڑیں یونانی اور رومی کلچروں سے ملادیں۔ ان دونوں میں ایک طرف یونانیوں کی فکر، دانش، اور فلسفیانہ گہرائی تھی تو رومیوں کے ہاں فوجی طاقت و شان و شوکت فتوحات اور بڑی سلطنت کا قیام تھا۔ اہل یورپ ان دونوں کے وارث ہو کر خود کو اس کا اہل ثابت کر رہے تھے۔

اس تحقیق کا اثر یورپ میں رہنے والے یہودی دانش وروں اور مفکرین پر یہ ہوا کہ انھوں نے اس کے ردعمل میں سامی تہذیبوں پر تحقیق شروع کی تاکہ اس طرح وہ اہل یورپ سے ذہنی و فکری طور پر مقابلہ کر سکیں۔ اس ضمن میں ان میں اسلامی تاریخ و تمدن سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس میں تحقیق شروع کی۔

عہد برطانیہ میں جب کہ حکومت اس بات کا پرچار کرتی تھی کہ صرف ان کے عہد میں ہندوستان کو ترقی ہوئی اور انھوں نے ہندوستان کو مذہبی آزادی دی تو اس کے جواب میں قوم پرستی کے تحت مغل تاریخ پر کام ہوا تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ ہندوستان مغل عہد میں ایک خوش حال اور ترقی یافتہ ملک تھا اور اس زمانہ میں کوئی مذہبی فرقہ واریت نہیں تھی اور ہندو و مسلمان آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔

اس لئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ تمام تاریخ زمانہ حال کی تاریخ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمانہ حال کے مسائل، بحران، اور تقاضے وہ اہم عناصر ہیں کہ جن کی وجہ سے گذرے ہوئے ادوار کے خاص پہلوؤں سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کبھی تو ان گذرے واقعات سے نفسیاتی طور پر سکون حاصل کیا جاتا ہے اور انھیں بطور پناہ گاہ کے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی ان سے سیکھا جاتا ہے کہ اس دور میں کیا غلطیاں ہوئیں تھیں؟ اور انھوں

نے اپنے دور کے مسائل کا کیا حل تلاش کیا تھا؟ جب حالات بدلتے ہیں تو پھر اس کے ساتھ دلچسپیاں اور تقاضے بدل جاتے ہیں اور اس کی مناسبت سے کوئی اور تاریخ کا عہد اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس لئے معاشرہ میں تمام گذری ہوئی تاریخ سے ایک دم دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ تاریخ کتابوں' آثاروں' کتبوں' اور دوسرے ماخذ میں محفوظ رہتی ہے' وقت آنے پر اسے پیدا کیا جاتا ہے اور اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر عہد میں تاریخ کے مختلف ادوار سے دلچسپی ہوتی ہے اور زمانہ حال قدیم کو اپنے نظریات کی روشنی میں بیان کرکے اس سے سیکھتا ہے۔

تاریخی حقائق خود بولتے ہیں

چونکہ ایک زمانہ تک تاریخ سیاست اور مذہب کے لئے استعمال ہوئی' اس وجہ سے یہ علم قابل اعتبار نہیں رہا اور اس کے ذریعہ حقائق کی سچائی تلاش کرنا' یا ان کو صحیح ثابت کرنا ممکن نہیں رہا- اس لئے اٹھارویں صدی میں اس بات کی کوشش ہوئی کہ تاریخ کو سائنس بنا کر' اس کے قوانین مرتب کر کے اس کو باضابطہ ایسا علم بنا دیا جائے کہ پھر کوئی طبقہ' یا جماعت اسے اپنے مفادات کے لئے استعمال نہ کر سکے اور اس کے ذریعہ سچائی تک پہونچنا ممکن ہو سکے-

اس مقصد کے لئے اس بات پر زور دیا گیا کہ مورخ کا کام یہ نہیں کہ وہ کوئی فیصلہ دے- بلکہ مورخ کا کام ہے کہ وہ حقائق کو جمع کرے- ان کو ترتیب دے- اور پھر یہ حقائق خود بولیں گے اور اپنی سچائی کا اعلان کریں گے-

لیکن تاریخ کو اس طرح سے تشکیل دینے کا کام اس لئے ناکام رہا کہ حقائق خود نہیں بولتے ہیں ان کی حیثیت ٹھنڈے' سرد' اور برف کے ٹکڑوں کی مانند ہوتی ہے' اور دراصل یہ مورخ ہے جو ان حقائق کو گرمی دیتا ہے- انھیں زبان دیتا ہے اور انھیں اس قابل بناتا ہے کہ ان کی بات سنی جائے- محض حقائق کو جمع کرنا- یا واقعات کو اکٹھا کرنا تاریخ نہیں- اس طرح سے یہ بے روح اور بے جان ہو کر بغیر کسی مفہوم کے رہ جاتے ہیں- محض حقائق نہ تو اپنا پس منظر بیان کر سکتے ہیں- اور نہ وجوہات و اثرات کا تجزیہ کر سکتے ہیں- مثلاً ایک سادہ سی تاریخی حقیقت یہ ہے کہ "ہندوستان پر محمود غزنوی نے حملہ کیا" اگر محض اس واقعہ کو بیان کیا جائے تو یہ تاریخ کے عمل کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دے گا کیونکہ اس ایک واقعہ کے پیچھے بہت سے عوامل تھے - محمود نے یہ حملہ اکیلے نہیں کیا تھا اس کے ساتھ فوج تھی' اسلحہ تھا گھوڑے تھے' بار برداری کے جانور تھے اور صرف فوج ہی نہیں تھی بلکہ اس فوج کے ہمراہ عام لوگ بھی تھے- ان سب کے اجتماعی عمل سے محمود کا ہندوستان پر حملہ ہو سکا- پھر اس کے بعد یہ سوالات آتے ہیں کہ اس حملہ کا ہندوستان میں کیا رد عمل ہوا؟ اور

اس رد عمل میں حکمرانوں سے لے کر زمیندار اور عام لوگ سب ہی شریک تھے ' اب جب تک ان کے جذبات ' احساسات اور خیالات کو معلوم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک یہ واقعہ محض ایک سادہ واقعہ رہے گا۔ مگر جب مورخ اس واقعہ کی پرتیں کھولنا شروع کرے گا ' تو پھر اس کے مختلف پہلو سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔ پھر سوالات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتے ' بلکہ ذہن میں سوال بھی آتا ہے کہ آخر محمود ہی نے ہندوستان پر کیوں حملہ کیا؟ اور ہندوستانی حکمرانوں نے محمود پر کیوں حملہ نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈتے تو دونوں جانب سے معاشی و سیاسی محرکات کا تجزیہ کرنا ہو گا اور ان قوتوں کا مطالعہ کرنا ہو گا کہ جنھوں نے تاریخی عمل کو یہاں تک پہونچایا۔ اس طرح ایک واقعہ اور ایک حقیقت کے ارد گرد کئی واقعات و حقائق ہوتے ہیں۔ جب تک ان کی تشریح نہیں کی جائے۔ ان کی تاویلات پیش نہیں کی جائیں۔ اس وقت تک تاریخی عمل سمجھ میں نہیں آتا۔

اس سلسلہ میں مورخ کو جس مشکل کا سامنا ہوتا ہے وہ یہ کہ واقعہ تو ماضی میں ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اس واقعہ کے بارے میں بیان پڑھتا ہے ' اور پھر یہ تعین کرتا ہے کہ واقعہ کب اور کس زمانہ میں ہوا؟ اس وقت کے حالات کیسے تھے؟ ان حالات کے پس منظر میں وہ واقعہ کی وجوہات اور نتائج نکالتا ہے اور ان کا تجزیہ کرتا ہے۔

نقطۂ نظر کے مختلف ہونے کی وجہ سے مورخین ایک ہی واقعہ سے مختلف نتائج نکالتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک حقیقت ہے کہ رومی سلطنت کا زوال ہوا۔ یہ زوال کیوں ہوا؟ اس پر کئی مورخوں نے اپنے نقطہ ہائے نظر کو بیان کیا ہے۔ کوئی اس زوال کا سبب مذہب اور بربریت کو قرار دیتا ہے ' کوئی اس کی وجہ امراء کے طبقہ کا عروج اور ان کی عیاشیوں کو بتاتا ہے۔ تو کوئی اس زوال کا سبب نسل کی خرابی قرار دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ زوال اس وجہ سے ہوا کہ رومی سلطنت میں آب و ہوا اور ماحول بدل گیا تھا۔ زراعتی زمین کے بنجر ہو جانے کی وجہ سے حکومت کی آمدنی گھٹ گئی تھی۔ کسان بیروزگار ہو گئے تھے اور محروم لوگوں کی تعداد میں اس طرح اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس کچھ مورخ اس زوال کی وجہ غلامی کے ادارے کا زوال بتاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے رومی حکمران طبقوں کو جو وقت ملتا تھا وہ ختم ہو

گیا' اور پھر اس زوال کی ایک وجہ امیروں اور غریبوں کے درمیان طبقاتی تصادم تھا کہ جس

نے رومی معاشرے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا - اور جب اس پر جرمن قبیلوں نے حملہ کیا تو ان کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں تھا - ٹائن بی کے نظریہ کے تحت رومی سلطنت کے سامنے جو چیلنج تھے وہ اس کا موثر جواب نہیں دے سکی - اور امراء نے تمام مراعات خود لے لیں اور غریبوں کو نچوڑ کر ادھ موا کر دیا - جس کی وجہ سے جب سلطنت خطرے میں آئی تو عوام نے سرد مہری کا اظہار کیا -

ان مختلف نقطہ ہائے نظر نے رومی سلطنت کے زوال کے واقعہ کو مختلف انداز میں پیش کیا اور ہر ایک نے اپنے نقطہ نظر کو درست ثابت کرنے کے لئے دلائل بھی دئے - اس لئے حقائق خود سے نہیں بولتے بلکہ انھیں مورخ اپنے نقطہ نظر کے لئے بولنے پر مجبور کرتا ہے - اور اس طرح ان کو ایک مفہوم دیتا ہے -

تاریخ اور فیصلہ

مورخ تاریخ کو لکھتے ہوئے کسی واقعہ اور شخصیت کے بارے میں اس وقت فیصلہ کرتا ہے جب کہ وہ واقعہ ہو چکا ہوتا ہے- یہ فیصلہ وہ اس وقت دیتا ہے جب کہ وہ اس کا مقابلہ تاریخ کے دوسرے واقعات سے کرتا ہے اور ان کے اثرات کا تجزیہ کرتا ہے- اس لئے مورخ کے فیصلہ کا دارومدار اس مواد پر ہوتا ہے جو کہ مورخ کو دستیاب ہوتا ہے- اور اس مواد کی بنیاد پر وہ کسی واقعہ دور یا شخصیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتا ہے-

تاریخ نویسی میں یہ ایک اہم سوال رہا ہے کہ کیا مورخ کو تاریخ لکھتے وقت کوئی فیصلہ دینا چاہئے یا نہیں؟ اس کی مخالفت کرتے ہوئے برطانوی مورخ بٹر فیلڈ نے یہ کہا کہ مورخ کا کام اخلاقی فیصلہ دینے کا نہیں- کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی انسان کے دل کے رازوں سے واقف نہیں ہوتا- اور عیسائی مذہب کی تو یہ روایت ہے کہ دوسروں کے بارے میں کوئی فیصلہ مت کرو' ایسا نہ ہو کہ تمہارے بارے میں فیصلہ کیا جائے-

بٹر فیلڈ اس بات پر زور دیتا ہے کہ مورخ کی حیثیت ایک جاسوس کی ہوتی ہے جو کہ مقدمہ کی پیچیدگیوں کو سلجھا کر سچائی اور حقیقت کو آشکار کرتا ہے- اس لئے مورخ کا کام یہ نہیں کہ کسی کو قصوروار ٹھہرائے- اس کا کام یہ ہے کہ ماضی کی اس طرح سے تشکیل کرے کہ جیسی کہ وہ تھی اور اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور بدلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ہمدردانہ فکر کے ساتھ تلاش کرے اور تحقیق کرے کہ ماضی میں کیا ہوا تھا- اس مقصد کے لئے اسے خود اپنے ذہن کو خالی کر کے تمام تعصبات سے پاک کرنا ہو گا- اس لئے اگر وہ کوئی اخلاقی فیصلہ دیتا ہے تو یہ فیصلہ اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے-

اگر تاریخ کو نیکی و بدی کے تصادم میں لکھا جائے گا تو اس سے تاریخی سچائی متاثر ہو گی- اس کی مثال یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نقطہ نظر سے اور ہمارے ہاں شیعہ و سنی نقطہ نظر سے لکھی گئی تاریخ ہے اس میں مورخ فیصلوں میں گھر جاتا ہے اور واقعات کی سچائی ان میں کھو جاتی ہے- ہوتا یہ ہے کہ اگر نظریاتی گروہ جو جرائم کرتے ہیں تو وہ اس کا

اخلاقی جواز پیش کرتے ہیں - اور اگر یہی جرائم دوسرا گروہ کرتا ہے تو اس پر وہ اخلاقی فیصلہ دے دیتے ہیں - اس وجہ سے ان فیصلوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی ہے -

اس کے برعکس ایک دوسرے مورخ ای ذک برلن کا کہنا ہے کہ ایک مورخ کو فیصلہ ضرور دینا چاہئے چاہے اسے کوئی پسند کرے یا نہ کرے - کیونکہ یہ ایک انتہائی خطرناک اقدام ہو گا اگر ہم نیرو تیمور لنگ یا ہٹلر کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ دیں اور انہیں آزاد چھوڑ دیں - وہ مزید کہتا ہے کہ اخلاقی فیصلہ سے انکار کا مطلب ہے کہ سماجی علوم اور سائنس کو خلط ملط کر دیا گیا ہے - چونکہ تاریخ سائنس نہیں ہے اس لئے واقعات کے بارے میں ہمارے جو خیالات ہیں - انہیں بیان نہ کرنا غیر فطری ہو گا -

تاریخ میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کیا انسانی معاشرہ کی اخلاقیات اور تاریخ کی اخلاقیات ایک ہوتی ہیں؟ اگر ان میں فرق ہے تو تاریخی واقعات کو عام اخلاقی اصولوں پر نہیں پرکھنا چاہئے - اس سلسلہ میں ہیگل کا کہنا ہے کہ تاریخ میں شخصیات اپنا مشن پورا کرنے کی غرض سے اگر اخلاقی اقدار کی پرواہ نہ کریں تو یہ ان کے لئے جائز ہے کیونکہ وہ اس سے بھی بڑھکر ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل کر رہی ہوتی ہیں اس لئے وہ اگر اپنے مخالفوں کو قتل کراتے ہیں - انہیں زہر دے کر مارتے ہیں اور ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں - تو یہ جائز ہے -

جب شاہ جہاں نے اپنے بھائی شہزادہ خسرو کو قتل کر دیا - تو اس وقت کے مورخ صالح کنبوہ نے اس قتل کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ دلائل دئے کہ اس طرح سے بادشاہ اپنے مخالفین کو راستے سے ہٹا کر ملک و سلطنت کو خوں ریزی اور قتل عام سے بچاتا ہے اور سلطنت کو استحکام دیتا ہے - اگر یہ دلیل صحیح ہے تو اس کے تحت اورنگزیب نے اپنے بھائیوں کو جس طرح سے قتل کرایا ہے وہ بھی جائز ہو جاتا ہے - اگر تاریخ کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا جائے تو پھر تمام ظالموں ' آمروں ' استحصال کرنے والوں کے ظلم و ستم کا جواز مل جائے گا - اور وہ تاریخ کی عدالت سے چھوٹ جائیں گے -

اس لئے تاریخ لکھتے ہوئے مورخ کو اخلاقی بنیادوں پر فیصلے دینے چاہئیں تاکہ ان کے

جرائم کی سزا انہیں تاریخ کی عدالت میں مل جائے اور دنیا کے سامنے ان کے جرائم آ جائیں اور انہیں یہ احساس ہو کہ تاریخ کی سزا سب سے کڑی ہوتی ہے۔

ہم عصر تاریخ کا لکھنا

کسی بھی مورخ کے لئے ہم عصر تاریخ کا لکھنا ایک مشکل کام ہوتا ہے 'کیونکہ اس تاریخ کو بنتے ہوئے جن لوگوں نے دیکھا ہوتا ہے وہ زندہ ہوتے ہیں - ان میں سے اکثر اس تاریخی عمل کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور اس لئے تاریخی واقعات اور شخصیتوں سے ان کا جذباتی لگاؤ ہوتا ہے - یہی صورت مورخوں کی ہوتی ہے کہ جو اس عمل میں اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں فیصلے کر لیتے ہیں - اور اس وجہ سے ان کے لئے تاریخ کو ذاتی جذبات سے علیحدہ کر کے لکھنا مشکل ہوتا ہے - اس صورت حال کا تجزیہ جرمنی کے مشہور مورخ مومزن نے کیا ہے وہ کہتا ہے کہ جو لوگ تاریخی واقعات اور ان کی تشکیل کے عمل سے گزرے ہیں - انہیں اس چیز کا جلد ہی احساس ہو جاتا ہے کہ تاریخ کو نہ تو بغیر محبت اور نفرت کے لکھا جا سکتا ہے اور نہ بنایا جا سکتا ہے - اس صورت حال کا سامنا مشہور انگریز مورخ گبن کو بھی ہوا - ابتدا میں اس کا خیال تھا کہ وہ انگلستان کی کسی مشہور تاریخی شخصیت پر تحقیق کرے - اس لئے اس نے رچرڈ اول 'بلیک پرنس' اور والٹر ریلے کے بارے میں سوچا لیکن اسے جلد ہی احساس ہوا کہ برطانوی معاشرہ میں ان شخصیتوں کے بارے میں لوگوں کی رائے میں اسقدر اختلاف ہے کہ یا تو لوگ ان کے چاہنے والے ہیں یا نفرت کرنے والے - اس صورت میں اس کی تاریخ کو پڑھنے کے لئے کھلے یا تعصب سے پاک ذہن نہیں ملیں گے - اس لئے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسے موضوع پر لکھے کہ جو ماضی کے ایک ایسے دور سے تعلق رکھتا ہو کہ جس کے بارے میں لوگ پہلے سے کوئی رائے نہیں رکھتے ہوں - اس موضوع پر وہ آزادی کے ساتھ 'بغیر کسی ڈر یا خوف 'یا تعصب کے کام کر سکے گا - یہی وجہ تھی کہ اس نے رومی سلطنت کے زوال کے موضوع کو منتخب کیا اور اس پر اپنی مشہور کتاب لکھی -

اس قسم کی صورت حال سے ہندوستان میں جادو ناتھ سرکار دو چار ہوا - ابتداء میں اس کا خیال تھا کہ ۱۸۵۷ء کی اہم واقعہ پر تحقیق کرے - مگر اس نے بھی جلد ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ

یہ موضوع برطانوی حکومت کے لئے بڑا حساس ہے - اور ایک لحاظ سے یہ ایک ایسا سیاسی موضوع ہے کہ جس کو اگر لکھا گیا تو ایک تو یہ حکومت کو پسند نہ ہو گا- اس لئے اس نے اس موضوع کو چھوڑ کر اورنگزیب کے دور حکومت پر تحقیق کی 'اگرچہ یہ کتاب فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی مگر اس سے حکومت ناراض نہیں ہوئی-

یہی صورت حال ہر معاشرہ میں مورخوں کو پیش آتی ہے کہ ہم عصر تاریخ پر اعتراضات بھی ہوتے ہیں اور اسے پسند بھی کیا جاتا ہے - پاکستان کے مورخوں (اگر تھوڑے بہت باقی ہیں تو) کے لئے بھی یہ مسئلہ اس وقت آتا ہے کہ جب وہ پاکستانی تحریک کی تاریخ لکھتے ہیں- کیونکہ اس تحریک میں جن لوگوں نے حصہ لیا ہے وہ اپنی پسند اور مرضی کے خلاف کچھ بھی سننا اور پڑھنا گوارا نہیں کرتے - اور نہ وہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے پر تیار ہیں بلکہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ صحیح تھا- چنانچہ ہمارے ہاں جو ہم عصر تاریخ لکھی گئی وہ مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے لکھی گئی - اور اس میں ہندو و مسلمان تصادم کا آہنگ تھا- تاریخ کا یہی نقطہ نظر حکومت کی جانب سے بھی منظور شدہ تھا- اس لئے نصابی کتابوں اور سرکاری دستاویزات میں اس پر زور دیا گیا- بلکہ سماجی اور قانونی دباؤ کے تحت اس کے خلاف کچھ کہنے اور لکھنے کی پابندی رہی - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری نئی نسل تاریخ کے دوسرے نقطہ ہائے نظر سے بالکل ناواقف رہی - انہیں نہ تو کانگریس پارٹی کے بارے میں زیادہ پتہ ہے نہ ہندوستان کی دوسری تحریکوں کے بارے میں جیسے غدر تحریک یا ۱۹۴۶ء میں ہندوستان بحریہ کی بغاوت نہ ہی ہندوستان کے سیاسی راہنماؤں 'ان کے افکار' اور ان کے تاریخی کردار کے بارے میں حقائق سے باخبر ہیں - یہاں تک کہ نیشنلسٹ مسلمان راہنماؤں کو بھی بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے-

جب پاکستان میں سیاسی حالات بدلے اور مختلف سیاسی 'مذہبی' اور سماجی جماعتیں ابھریں تو ان سب کے نظریات تنگ نظری پر مبنی تھے - جمہوری عمل کے فقدان کی وجہ سے لوگوں میں سیاسی شعور کی کمی رہی اور تاریخ میں لوگوں کے عمل کو گھٹا کر پیش کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ صرف ہیروز اور بڑی شخصیتیں ان کے مسائل کو حل کر سکتی

ہیں۔ اس لئے لوگ حکومتی اداروں کی خرابیوں کو بھول کر شخصیتوں کو موردالزام

ٹھہرانے لگے اور یہ امید کرنے لگے کہ ایک بری شخصیت جائے گی تو دوسری اچھی شخصیت آکر تمام مسائل کو حل کر دے گی۔ تاریخ بھی ان شخصیتوں پر لکھی گئی۔ اوران کے پیچھے جو سیاسی و معاشی اور سماجی قوتیں تھیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

ایک دوسرا عنصر جس نے ہم عصر تاریخ کو مسخ کرنے میں حصہ لیا وہ یہ تھا کہ ہر مذہبی وسیاسی جماعت نے ملک میں اپنے اثر و رسوخ کو پھیلانے اور مستحکم کرنے کے لئے تاریخ کو اپنے نقطہ نظر سے لکھنی شروع کر دی تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے نظریات کی سچائی کو قائم کریں۔ جہاں ان کے مفادات کے خلاف تاریخی ثبوت اور حقائق تھے انہیں تبدیل کر دیا گیا۔ اوراس مقولہ کے مطابق کہ "اگر تمہیں ماضی پسند نہ آئے تو اسے تبدیل کر دو" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ ان جماعتوں کے ہاتھوں میں سیاسی اور مذہبی آلہ کار بن کر رہ گئی۔ اور اس کے ذریعہ انہوں نے اپنے اپنے مقلدین کے ذہنوں کو اس قدر مسخ کر دیا کہ وہ اس کے خلاف کچھ سننے پر تیار نہیں۔

ان حالات میں پاکستان کی تاریخ لکھنا انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ ایک طرف تو حکمران طبقوں کے اپنے مفادات ہیں کہ جن کے تحت وہ تاریخ لکھوانا چاہتے ہیں تو دوسری طرف سیاسی ومذہبی جماعتیں ہیں۔ اس لئے ہم عصر تاریخ جو بھی لکھی گئی اس میں یہ دباؤ کارفرما نظر آتے ہیں۔

ہم عصر تاریخ کو اگر تجزیاتی انداز میں لکھا جائے تو اس کے ذریعہ موجودہ مسائل کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً اسوقت جو تضادات ابھر کر سامنے آرہے ہیں ان میں لسانی و نسلی بنیادوں پر گروہ بندیاں علاقائی قوم پرستی کے رجحانات' اکثریت و اقلیت کے درمیان بدگمانیاں' حکمران طبقوں کی مراعات میں اضافہ' سیاسی جماعتوں کی بے عملی' سیاست دانوں کی ناکامی' سیاسی کارکنوں کی بے قدری' سیاسی بات میں ذاتی انا و ہٹ دھرمی' قوت برداشت کا فقدان' رشوت و بدعنوانیوں کا بڑھنا' ملک کی سالمیت پر بے یقینی' اور یہ سوچنا کہ صرف علیحدگی کی صورت میں مسائل حل ہوں گے۔ ان مسائل کی جڑیں تحریک پاکستان کی تاریخ میں پوشیدہ ہیں۔

مثلاً تاریخ کو اب جس نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے اس میں مسلم قومیت کا نظریہ سب سے اہم ہے جس میں اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کس طرح سے ایک قوم بنی - اور ایک قوم بن کر اس نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا- چنانچہ اسی بنیاد پر آج نسلی و لسانی اقلیتیں علیحدہ قوم ہونے کا مطالبہ کر رہی ہیں - اگر انہیں بھی علیحدہ قوم تسلیم کر لیا گیا تو پھر ان کے علیحدہ وطن کے مطالبہ کو بھی ماننا پڑے گا-

تحریک پاکستان کی تاریخ میں شملہ وفد کی کامیابی کو اہمیت اس لئے دی جاتی ہے کہ اس وفد نے جداگانہ انتخاب اور ملازمتوں میں کوٹہ سسٹم کو منظور کرایا تھا- ان کے ان مطالبات کی بنیاد اس دلیل پر تھی کہ مسلمان چونکہ پس ماندہ اور کم تعلیم یافتہ ہیں اور ہندوؤں سے مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے انہیں ملازمتوں میں کوٹہ دیا جائے - اور جداگانہ انتخاب کے ذریعہ ان کو نمائندگی ملنی چاہئے لیکن آج جب کوٹہ سسٹم انہیں بنیادوں پر روشناس کرایا جاتا ہے تو اس کی مخالفت کی جاتی ہے -

ملک تقسیم ہونے کے جو فوائد گنوائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ تقسیم کے نتیجہ میں مسلمانوں کو حکومت اور انتظامیہ میں بڑے بڑے عہدے ملے - اگر ملک تقسیم نہیں ہوتا تو ہندو کسی مسلمان کو آگے نہیں بڑھنے دیتے نہ ان کے سیکرٹری ہوتے اور نہ فوج میں کرنل و جنرل - اسی بنیاد پر آج علیحدگی پسندوں کی تحریکوں میں بھی یہی دلیل دی جاتی ہے - موجودہ نظام میں ان کے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے تمام راستوں کو روک دیا گیا ہے - اور علیحدہ ملک بنا کر وہ اپنی حکومت بنائیں گے اور وزیر سفیر و جنرل بنیں گے -

کسی ملک کے بانی ہونے کے اعزاز جو ان ملکوں کی تاریخ میں ملتا ہے اس اعزاز کو حاصل کرنے کی آج بہت راہنماؤں کو خواہش ہے --

تاریخ اور جنگ

تاریخ اور جنگ کا تعلق بڑا پرانا ہے کیونکہ جنگ کو ابتداء ہی سے ایک ایسا واقعہ سمجھا جاتا تھا کہ جس کی تفصیل سے نہ صرف مورخ کو دلچسپی تھی بلکہ قارئین بھی اس موضوع کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے تھے - ہندوؤں کی مذہبی کتاب مہابھارت اگرچہ مستند تاریخی کتاب نہیں مگر اس میں جنگ کو موضوع بنا کر اسے مرکزی حیثیت دی گئی ہے - یونان کے دو مشہور مورخوں نے بھی جنگ ہی کو اپنا موضوع بنایا اور ٹروجن جنگیں' ایرانیوں سے مبارزت آرائی اور یونان کی ایشیا پر فتوحات' یہ یونانی مورخوں کے پسندیدہ موضوعات تھے - بعد میں یورپ میں تاریخ میں صلیبی جنگیں اہمیت کی حامل رہیں - عربوں' ایرانیوں اور ترکوں نے بھی جو تاریخیں لکھوائیں ان میں جنگوں اور فتوحات کی تفصیلات سب سے زیادہ ہیں -

انیسویں صدی میں جنگ کا موضوع نہ صرف مورخوں کے لئے دلچسپی کا باعث رہا بلکہ مفکرین نے بھی جنگ کی اہمیت پر نئے نئے خیالات کا اظہار کیا اور جنگ کو معاشرہ کے لئے اس لئے ضروری قرار دیا کہ اس سے معاشرہ کا جمود ٹوٹتا ہے - خطرے کے دفاع میں ذہنی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں - اور نئی نئی ایجادات کی کوششیں ہوتی ہیں - اس کی مثال پہلی جنگ عظیم کی ہے کہ جس میں گھی یا مکھن کے نعم البدل کے طور پر جرمنوں نے بناسپتی گھی کی ایجاد کی - کیونکہ جنگ کی وجہ سے اس کی کمی ہو گئی تھی - اسی طرح ان کے خیال میں جنگ بزدلی کم ہمتی اور بے عملی کا خاتمہ کرتی ہے - اگر وقتاً فوقتاً جنگ ہوتی رہے تو معاشرے باعمل اور متحرک رہیں گے اور ان کی اندرونی زندگی میں ترقی ہوتی رہے گی - ان جنگوں کے نتیجہ میں تجارت کو بھی فائدہ ہو گا - اور صنعت کار دستکار' و ہنرمندوں کو زیادہ سے زیادہ کام ملے گا - اس مناسبت سے جنگ سے متعلق جتنی صنعتیں ہیں ان میں ترقی ہو گی -

یورپ میں عہد وسطیٰ میں جنگ امراء کے لئے ایک پیشہ بن گئی تھی - اسے بطور پیشہ اختیار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اپنے گروپ اور جماعتیں بنائی تھیں - ان میں سے

اکثر خود کو مذہب کی خاطر لڑنے والا کہا کرتے تھے - اور کچھ مظلوموں کی حمایت کرتے تھے - انھوں نے جنگ اور لڑنے کے لئے ضابطہ اخلاق بنایا تھا - اور اس میں دشمنوں کے ساتھ سلوک اور دوسری باتیں شامل تھیں - اس وجہ سے جنگ اس طبقہ کے لئے فخر کا باعث بن گئی - اور میدان جنگ میں لڑنا اور عزت کیلئے جان دینا قابل قدر چیز بن گئی - ابتداء میں انھوں نے صلیبی جنگوں میں حصہ لیا - مگر جب یہ جنگیں ختم ہو گئیں تو پھر یہ آپس میں لڑتے رہے -

جنگ کو ایک قابل قدر پیشہ بنا کر اس میں حصہ لینے والوں کے لئے جو اوصاف استعمال کئے گئے ان میں بہادری شجاعت ، بے خوفی ، جرات مندی اور دشمنوں کو قتل کرنا خوبی کی بات تھی - اس لئے ان جنگوں میں جو خون ریزی ہوئی لوگوں کا قتل عام ہوا - شہر لوٹے گئے ، گاؤں جلائے گئے ، اس پر کسی کو پشیمانی نہیں ہوئی - بلکہ اس پر ہمیشہ فخر کیا گیا کیونکہ جنگ کا دوسرا پہلو بڑا بھیانک ہے - اس میں نہ صرف فوجی قتل ہوتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ معصوم بچے و عورتیں اور بے گناہ شہری بھی مارے جاتے ہیں - منگول جب اپنے دشمنوں پر فتح پا لیتے تھے تو ان کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتے تھے - بابر بھی اس رسم کو ہندوستان میں لایا اور یہاں اس نے اپنے دشمنوں کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرائے - راجپوت جب جنگ میں اپنی شکست کے آثار دیکھتے تھے تو وہ اپنے بیوی بچوں کو قتل کر کے - خود زرد لباس پہن کر آخر دم تک لڑ کر جان دے دیتے تھے - ان جنگوں نے نہ صرف شہروں اور گاؤں کو تباہ کیا بلکہ ترقی یافتہ تہذیبوں اور تمدنوں کو تباہ کر دیا - وقت کے ساتھ انسان کا ذہن نہیں بدلا اور انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کا قتل عام جاری رہا - پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیاں بھی اس کو سبق نہیں سکھا سکیں -

دوسری جنگ عظیم کے بعد اتحادی طاقتوں نے جرمنی اور جاپان کو مجرم قرار دیا کہ انھوں نے مفتوحہ علاقوں اور ملکوں میں لوگوں کا قتل عام کیا - اس سلسلہ میں دونوں ملکوں کے جنگی مجرموں پر مقدمات بھی چلائے گئے - مگر جاپان تو اس جرم سے اس لئے نکل آیا کہ امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کے ان دو شہروں کو تباہ کر دیا اور اس وجہ سے

اس کے جنگی جرائم پس منظر میں چلے گئے مگر جرمنی کے جرائم کو کتابوں فلموں اور دوسرے ذرائع سے برابر ابھارا گیا- اور خود جرمنی قوم جرم کے احساس میں مبتلا رہی- برلن میں جنگ کے زمانہ کا تباہ شدہ چرچ کا ایک حصہ انھوں نے بطور یادگار محفوظ رکھا-

مگر جب ویت نام کی جنگ میں امریکہ نے ویت نامیوں کا قتل عام شروع کیا اور ان کے ایک فوجی جس نے مائی لائی میں ان کا قتل عام کیا تھا- اس کا امریکہ میں بطور ہیرو استقبال ہوا- تو جرمنوں میں اس کا شدید رد عمل ہوا- (اگرچہ رسل کے ٹریبون نے ویت نام کے جنگی مجرموں پر مقدمہ بھی چلایا مگر اس کی نوعیت اخلاقی تھی) اور جرمنوں کی نئی نسل نے خصوصیت سے خود کو ان جرائم سے غیر متعلق کر لیا کہ ان جرائم کی حیثیت ایک نسل تک محدود تھی- اس کی وجہ سے پوری جرمن قوم ہمیشہ کے لئے مجرم قرار نہیں دی جا سکتی-

جرمنی میں اس وقت رد عمل کے طور پر دو قسم کی تاریخیں لکھی جا رہی ہیں- ایک تو یہ کہ ہٹلر کے ہاتھوں خود جرمنوں نے سخت نقصانات اٹھائے- کیونکہ اس نے مخالفین کو بالکل ختم کرا دیا اس لئے وہ ان مزاحمتی تحریکوں کو اہمیت دے رہے ہیں- جو کہ ہٹلر کے زمانہ میں اس کے خلاف اٹھیں- اس سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے- کہ ہٹلر کے جرائم میں ساری جرمن قوم ملوث نہیں تھی- اور اس کے مخالفوں کی تعداد خود جرمنی میں کم نہ تھی- اور انھوں نے کس کس طرح کیسے کیسے اس کی حکومت کا تختہ الٹنے اور اسے قتل کرنے کی کوششیں کیں-

دوسرا رجحان یہ ہے کہ بعد میں آنے والے آمروں' اور ڈکٹیٹروں نے اپنے عوام کو جس طرح کچلا اور دبایا- اور دوسرے ملکوں میں جو خوں ریزی کی آخر انہیں برا کیوں نہیں کہا جاتا؟ اور انہیں کیوں بطور ہیرو پیش کیا جاتا ہے- اگر وہ ہیرو ہیں تو پھر ہٹلر میں کیا خرابی تھی؟

اس جرمن قوم کی نئی نسل اس احساس جرم سے خود چھٹکارا پانا چاہتی ہے کہ جس کی وہ ذمہ دار ٹھہرائی گئی تھی- تاریخ کی ستم ظریفی یہی ہے کہ جو اقوام جنگی جرائم کرتی ہیں وہ خود

انہیں کبھی تسلیم نہیں کرتیں - بلکہ ان پر فخر کرتی ہیں - جلیان والے باغ کے قتل عام کے ذمہ دار کرنل ڈائر کا اہل انگلستان نے بطور ہیرو استقبال کیا - اور اسے سلطنت برطانیہ کا محافظ قرار دیا ہے یہی وہ جذبات ہیں کہ جو جنگ اور قتل و غارت گری کو زندہ رکھتے ہیں اور ان پر نادم نہیں ہوتے -

قوموں کا عروج و زوال

تاریخ میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں مفکرین کے لئے غور و فکر کا باعث رہی ہیں اور وہ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں مصروف رہے کہ یہ عروج و زوال کیوں ہوتا ہے؟ کیا اس کے کچھ قوانین ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ان کا اطلاق ہر قوم اور تمدن کے عروج و زوال پر ہو سکتا ہے؟ اس میں سے کچھ نے تو قوموں کے عروج و زوال کو بائیولوجیکل عمل کے تحت دیکھا کہ جس طرح انسانی زندگی مختلف مراحل سے گزر کر موت سے ہمکنار ہوتی ہے قومیں بھی اس عمل سے دوچار ہوتی ہیں - اس نظریہ کو ابن خلدون اور اشپنگلر نے دلائل کے ساتھ پیش کیا - اگرچہ ٹائن بی بھی اس کا قائل ہے مگر وہ قوم یا تمدن کی تباہی کا ذمہ دار تخلیقی اقلیت کو ٹھہراتا ہے کہ جو فاش غلطیاں کرتی ہے اور قوم کو زوال کی جانب لے جاتی ہے - اگر تخلیقی اقلیت ان غلطیوں کا ارتکاب نہیں کرے اور خود کو وقت کے مطابق بدلتی رہے تو اس صورت میں اس کے زوال کا عمل رک سکتا ہے -

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ قوموں کا زوال اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو زیادہ وسعت دے دیتی ہیں - اور یہ پھیلاؤ ان کے لئے موت کا باعث ہوتا ہے - موجودہ دور میں اس کی مثال برطانیہ کی وسیع و عریض سلطنت تھی - کہ اس چھوٹے سے ملک نے خود کو اس قدر پھیلا دیا کہ اس کے معاشرہ کے لئے ناممکن ہوگیا کہ اس بڑی سلطنت کی دیکھ بھال کر سکے - کیونکہ اس صورت میں اس کی صلاحیتیں بھی بکھر گئیں اور وہ اپنی توانائی کو برقرار نہیں رکھ سکا - اتنی بڑی سلطنت کے لئے ہزاروں کی تعداد میں انتظامیہ کے عہدے دار، فوجی افسر، اور دوسرے کارکن چاہیئے تھے جو برطانیہ کے لئے تیار کرنا مشکل تھا - جب انہوں نے اپنی مدد کے لئے مقامی لوگوں کو لیا - تو انہیں لوگوں میں قومیت کا جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے برطانیہ کے خلاف تحریک آزادی شروع کی -

زوال کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ معاشرہ کی حکمران اقلیت بدلتے ہوئے تقاضوں اور نئے مسائل کو ماضی کے طریقوں اور حربوں سے حل کرنا چاہتی ہے - انہیں ماضی کے

علم و دانش پر اعتقاد ہوتا ہے اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ قدیم طریقوں سے وہ جدید دور کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں ان کا یہ فخر و غرور اور تبدیلی سے بے خبری انہیں دن بدن نئے نئے مسائل میں الجھاتی چلی جاتی ہے اور یہی عمل ان کے زوال کا باعث ہوتا ہے۔

وہ قومیں کہ جن کے ہاں ترک دنیا کے فلسفہ پیدا ہونے لگتے ہیں اور انہیں مقبولیت ہو جاتی ہے وہاں معاشرے میں اس کی وجہ سے بے عملی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس مادی دنیا اور اس کی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے اور اپنی صلاحیتوں کو روحانی ترقی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہ برابر پس ماندہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن اگر دیکھا جائے تو نہ تو قوموں کا عروج ہوتا ہے اور نہ زوال۔ یہ عروج و زوال ہر معاشرہ اور قوم میں اقلیتی طبقوں کا ہوتا ہے وہی سیاسی طور پر باقتدار ہوتے ہیں۔ انہیں کے پاس مادی وسائل ہوتے ہیں اور وہی ان وسائل کے سہارے تہذیب و ثقافت اور نظریات و افکار پیدا کرتے ہیں۔ جب کہ قوم کی اکثریت جن کا تعلق محروم طبقوں سے ہوتا ہے وہ ان تمام سرگرمیوں سے لاتعلق اور علیحدہ محنت و مزدوری اور مشقت کے کاموں میں مصروف اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے میں دن رات ایک کئے رہتے ہیں لہٰذا وہ تو تہذیب و ثقافت کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں اور نہ ہی نظریات و افکار تخلیق کر سکتے ہیں۔ اس لئے قومیں جب عروج پر ہوتی ہیں۔ جب ان کے پاس دولت کے انبار ہوتے ہیں۔ تو اس وقت بھی ان کی اکثریت غربت و جہالت کی زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔ برطانیہ کی سلطنت جب اپنے عروج پر تھی۔ تو اس وقت بھی اس کے معاشرے کے غریب روٹی کپڑے اور مکان سے محتاج تھے۔ اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ اس کے سارے فوائد حکمران طبقے خود اٹھاتے تھے اور عوام کو ان سے محروم رکھتے تھے۔

اس طرح جب قومو کا زوال ہوتا ہے تو اس سے بھی یہی لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ انہیں کی دولت میں کمی آتی ہے انہیں کی مراعات چھنی جاتی ہیں اور انہیں کی جائدادیں ختم ہوتی ہیں۔ اور جب ایک نظام ٹوٹتا ہے تو اس کے نتیجہ میں تمام ثقافتی سرگرمیاں بھی

[illegible]

میں کوئی فرق نہیں آتا - ملک میں بدامنی قانون شکنی اور چوری وڈاکہ سے یہ لوگ اس لئے متاثر نہیں ہوتے کہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی کہ جسے چوری کیا جاسکے - اور ان کے حقوق پر ڈاکہ تو ہر دور میں ڈالا جاتا رہا ہے - اس لئے زوال سے بھی حکمران طبقے ہی متاثر ہوتے ہیں -

چونکہ حکمران طبقے خود کو قوم سمجھتے ہیں - اس لئے وہ اپنے عروج و زوال کو قوم کا عروج و زوال اور اپنے مفادات کو قوم کے مفادات کہتے ہیں -

ان طبقوں کے عروج کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ متحد ہو کر قوم کی دولت پر قابض ہو جاتے ہیں اور پھر ملک کے وسائل کو استعمال کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کرتے ہیں - مگر جب وسائل بڑھ جاتے ہیں - دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو پھر ان کی تقسیم اور اجارہ داری پر ان میں اختلافات بڑھتے ہیں - سازشیں ہوتی ہیں - اور ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لئے تمام حربوں کو استعمال کیا جاتا ہے - اس طرح ان کا اتحاد ختم ہو کر ان کی صلاحیتیں یا تو اپنے مراعات کے تحفظ کے لئے استعمال ہوتی ہیں یا جوڑ توڑ اور سازشوں میں -

چونکہ اس پورے عمل میں عوام کی اکثریت کو شریک نہیں کیا جاتا اس لئے ان کی ہمدردیاں ان سے نہیں ہوتیں - اور عوام کو کاٹ کر یہ قوم اور معاشرہ کی بہترین صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضائع کر دیتے ہیں - اور ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے - اگر عوام کو حکومتی اقتدار اور ملک کے وسائل میں شریک کر لیا جائے - تو اس صورت میں معاشرہ ایک توانائی کے ساتھ آگے بڑھے گا - کیونکہ ذہانت اور صلاحیت کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی ہے اگر سب کو برابر کے مواقع ملیں تو معاشرہ میں نہ صلاحیت کی کمی ہو گی اور نہ ذہانت کی - اور اس صورت میں قومیں نہ صرف اپنے زوال کو روک سکتی ہیں بلکہ وہ برابر آگے کی جانب بڑھتی ہوئی ترقی کر سکتی ہیں -

تاریخ اور تسلسل

دنیا کی تاریخ کو اگر وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال ہوتا رہتا ہے - نئی تہذیبیں اور تمدن پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں - مگر مجموعی طور پر عالمی تہذیب و تمدن میں ایک تاریخی تسلسل برقرار ہے - ایک قوم یا تہذیب جو چھوڑ جاتی ہے وہ باقی رہتا ہے اور اس کی بنیاد پر دوسری قومیں مزید تعمیر کرتی ہیں - کسی تہذیب کے زوال کو اسی وقت محسوس کیا جاسکتا ہے کہ جب اس میں توانائی باقی نہ رہے اور اس کی تخلیقی صلاحتیں ختم ہو جائیں - ایک تمدن اگرچہ کچھ تخلیق کرتا ہے تو وہ صرف اس کے لئے ہی نہیں ہوتا - بلکہ اس سے پوری انسانیت فائدہ اٹھاتی ہے - شکسپیئر کی شاعری سے صرف انگریز ہی لطف اندوز ہونے کا حق نہیں رکھتے بلکہ اس سے ہر قوم اور ہر فرد فائدہ اٹھاتا ہے - اس طرح اگر بیماری کی کوئی دوا امریکہ میں دریافت ہوئی ہو' تو اس کے علاج کرنے کا حق ایشیاء و افریقہ کے تمام افراد رکھتے ہیں - اس لئے کسی بھی قوم کے تمدن و تہذیبی سرمایہ پر انسانیت کا حق قائم ہو جاتا ہے -

یہی وجہ رہی ہے کہ مصری 'یونانی' اور میسوپوٹامیہ نے جو کچھ چھوڑا - آنے والی قوموں نے اس سے فائدہ اٹھایا - یونانی علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے تو اس سے ان کی تہذیب میں آگہی و دانش کے دریچے کھل گئے - انھیں عربوں نے چین سے کاغذ - ریشم - بارود - اور دوسری کئی چیزوں کا علم سیکھا - اور پھر اسے آگے بڑھایا -

تاریخ میں کوئی قوم یا تہذیب اکیلی اور تنہا نہیں رہ سکتی - اس کا دوسری قوموں اور تہذیبوں سے اشتراک ہوتا ہے - اس اشتراک کو مضبوط کرنے میں قوموں کی ہجرت' جنگیں سفارتی تعلقات' تجارت اور مذہبی مشن مدد دیتے ہیں جو تہذیبی اور ثقافتی روابط پیدا کر کے اجنبیت کی دیواریں توڑتے ہیں -

یہ ضرور ہوتا ہے کہ کوئی قوم یا تمدن جو نظریات و افکار تخلیق کرتی ہے' وہ بدلتے ہوئے زمانہ کے لحاظ سے فرسودہ ہو جاتے ہیں اور ان کی عملی حیثیت ختم ہو جاتی ہے - مگر ان

کی تاریخی حیثیت باقی رہی ہے- مثلاً آج بھی ارسطو افلاطون اور سقراط کے نظریات کو اس لئے پڑھا جاتا ہے کہ ان کی بنیاد پر زمانہ کی ضروریات کے مطابق نئے افکار تخلیق ہوں- قدیم تہذیبوں میں میسوپوٹامیہ اور مصر نے ریاضی- طب- اور ستارہ شناسی میں جو کام کئے تھے- آج کی تحقیق ان کو سمجھے بغیر مکمل نہیں ہوتی- اور ہم بھی جب تک ان قدیم علوم سے واقف نہ ہوں جدید علوم کی ترقی اور ان کے جدید پہلوؤں کو پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتے-

قدیم تہذیب و تمدن کی تخلیقات کے باعث یہ ممکن ہوا کہ آگے بڑھا جا سکے- جب ماہر تعمیرات کے سامنے یونانی اور مصری تعمیرات کے نمونہ آئے تو ان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ ان سے ہٹ کر تعمیر میں نئے راستے تلاش کریں- جب کوئی ایک چیز اپنی جگہ مکمل ہو جاتی ہے تو اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ ذہن اس سے ہٹ کر کوئی اور راستہ نکالے- کیمرے کی ایجاد نے جب مصوروں میں حقیقت پسندی کی تکمیل کر دی تو اس وقت تجریدی آرٹ پیدا ہوا- اس لئے قدیم تہذیبوں کے فنا ہونے کے باوجود ان کے ورثہ نے آگے بڑھنے کے راستے بنائے- اور اس طرح انھوں نے تاریخی تسلسل کو باقی رکھا-

لیکن قدیم تہذیبوں سے انسان اس وقت ہی سیکھتا ہے جب کہ علم باقی رہے، اگر کسی ایجاد کا علم اس کے ساتھ ختم ہو جائے تو وہ انسان ذہن کے لئے ایک معمہ بن کر رہ جاتی ہے- جیسے مصر کے اہرام تو باقی رہ گئے مگر ان کی تعمیر کا علم باقی نہیں رہا- اس لئے ذہن اس کو سمجھنے سے قاصر ہے- یہی صورت ممیوں کی ہے کہ جن کا علم بھی پوری طرح نہیں ہے- موہنجوداڑو سے ملنی والی سلیں بھی اس لئے بیکار ہو کر رہ گئیں کہ ان کو پڑھنے کا علم نہیں- اس صورت میں قدیم آثار، اوزار، اور اشیاء اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں، اور علم سے یہ بے خبری تاریخی تسلسل کو توڑ دیتی ہے-

لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود انسان کی کوشش یہ ہے کہ وہ ایک انسانی تاریخ کی تشکیل کرے- اور اس انسانیت نواز تمدن کے ڈھانچہ کو بنائے کہ جس میں ہر نسل و ہر قوم کا ورثہ شامل ہے- کوئی ایک قوم دنیا کی تہذیب، یا انسانیت کی اجارہ دار نہیں، اس کی تعمیر اور

ترقی میں ہر قوم کا برابر کا حصہ ہے۔ قومیں آتی جاتی رہیں گی' اور تہذیبیں بنتی و بگڑتی رہیں گی' مگر مجموعی طور پر انسانی تہذیب برابر ترقی کرتی رہے گی۔

مذاہب کیوں بدلتے ہیں؟

ایک عرصہ تاریخ میں صرف سیاسی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا جس کی وجہ سے تاریخ ماضی کی سیاست بن کر رہ گئی - مگر اب معاشرہ کے دوسرے تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی تحقیق ہو رہی ہے جس کی وجہ سے تاریخ کا دائرہ کار بڑھتا جا رہا ہے - اس میں خصوصیت سے اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ معاشرہ میں روایات‘ رسوم و رواج‘ عقائد کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ کن ضروریات کے تحت اداروں کی تشکیل ہوتی ہے اور پھر کیوں کر ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں؟ تاریخ میں تبدیلی کی وجہ کو معاشرہ کے بدلتے ہوئے تقاضے اور ضروریات کو کہا جاتا ہے جو کسی روایت اور ادارے کو ایک حالت میں نہیں رہنے دیتیں - جب معاشرہ کی روایات اور اداروں کا ارتقائی مطالعہ کیا جائے کہ کن کن مرحلوں پر ان میں کن مفادات‘ اور تقاضوں کے تحت تبدیلیاں آئیں‘ تو یہ مطالعہ ذہن کو ایک نیا شعور اور روشنی دیتا ہے اور اس کی مدد سے تاریخ کی پیچیدگیوں کو سمجھا جا سکتا ہے -)

اسی بنیاد پر اگر دنیا کے مذاہب کا ارتقائی مطالعہ کیا جائے‘ تو مذہب میں ہونے والی تبدیلیوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے اور یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ یہ تبدیلی کس مرحلہ پر ہوئی - کیونکہ اس کا جواب معاشرہ کی تبدیلی میں ملتا ہے کہ جیسے جیسے اس کی ضروریات بدلتی گئیں وہ ان کے مطابق اپنے مذہبی عقائد اور روایات کو ڈھالتا گیا - اس کی مثال ابتدائی عیسائیت میں ملتی ہے‘ یہ مذہب طاقت ور رومی سلطنت کے سایہ میں ابھرا‘ اور رومی معاشرہ کے غریب و پسے ہوئے مظلوم عوام میں اس میں بے انتہا دلکشی نظر آئی کیونکہ یہ ظلم کو سہنے کی تلقین کرتی تھی - اور مصائب کا اجر آخری دنیا میں پانے کی امید‘ کمزور لوگوں کے امن‘ اخوت‘ مساوات‘ اور عدم تشدد کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے - کیونکہ انھیں کے ذریعہ وہ خود کو استحصالی طبقوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں‘ مگر جیسے ہی عیسائی مذہب کو حکمرانوں نے اختیار کیا‘ اور ان کے پاس سیاسی قوت آئی وہ عدم تشدد‘ امن اور انسانیت کو بھول گئے - اور جنگوں‘ خوں ریزی و قتل عام کے ذریعہ انھوں نے اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کی‘ اور مذہبی تبلیغ کے

لئے بھی ہر سازش اور قوت کو استعمال کیا۔

اس تبدیلی کو ہم اسلام میں بھی دیکھتے ہیں' اس کا ابتدائی زمانہ سادگی' جمہوری' اور حریت کی اقدار کو لئے ہوئے تھا۔ مگر جب شام و ایران فتح ہوئے' تو ملوکیت قائم ہوئی۔ اور اس ملوکیت کو سیاسی تقاضوں کے تحت فقہانے اسلامی قرار دیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بادشاہ کے بغیر معاشرہ انتشار اور خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔ جب عباسی خاندان اور ان کی سلطنت کا زوال ہوا تو چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتیں وجود میں آگئیں۔ تو اس موقع پر پھر یہ فتویٰ دیا گیا کہ اگر کوئی غاصبہ طاقت کے ذریعہ سلطنت پر قبضہ کر لے تو اس کو اس لئے تسلیم کر لینا چاہئے کہ غاصب کے پاس طاقت ہے' اس طرح سیاسی نظاموں کی تبدیلی کے ساتھ فتوں بھی بدلتے رہے۔ یہاں تک کہ آج آمرانہ طرز حکومت اور جمہوریت دونوں کے لئے مذہبی جواز موجود ہے۔

اس طرح مذہبی رویوں میں یہ تبدیلی صرف سیاست ہی میں نہیں آئی۔ بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی ضروریات کے تحت مذہب کو بدل لیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ اگر مذہبی تعلیمات یا عقائد کسی گروہ اور جماعت کی راہ میں رکاوٹ ہوئے۔ اور انھوں نے اس چیز کو محسوس کیا کہ وہ ان کی موجودگی میں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ترقی کر سکتے ہیں۔ تو اس صورت میں یہ اکثریتی جماعت سے علیحدہ ہو کر اپنا دنیا فرقہ بنا لیتے ہیں۔ اور اپنی ضروریات کے تحت مذہب کی تعلیمات اور عقائد کو بدل لیتے ہیں انھیں ترقی پسند فرقے کہا جا سکتا ہے۔ فرقہ بننے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب کوئی ایک جماعت یہ دیکھتی ہے کہ اکثریتی جماعت مذہب کو اپنی پسند کے مطابق بدل رہی ہے تو وہ اس سے علیحدہ ہو کر مذہب کی اصلی تعلیمات پر پابند رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ قدامت پسند فرقے ہوتے ہیں' اور ہونے والی تبدیلی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آج بھی امریکہ کے دور دراز علاقوں میں ایسے عیسائی فرقے ہیں کہ جن کے ہاں ریڈیو۔ ٹی۔ وی' بجلی کا استعمال قطعی نہیں' اور نہ ہی موٹر' یا دوسری ایجادات کو استعمال کیا جاتا ہے یہ لوگ قدیم طریقہ زندگی کو تمام جدید ترقیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ترقی پسند اور قدامت پسند دونوں فرقے مذہب سے بغاوت نہیں کرتے - بلکہ اکثر یہ فرقے سے علیحدہ ہوتے ہیں - ان میں ترقی پسند فرقے مادی لحاظ سے ترقی کرتے ہیں اور دنیا کے کاروبار میں عملی حصہ لیتے ہیں - مگر قدامت پسند فرقے اپنی روایات اور عقائد کو محفوظ رکھنے کی غرض سے معاشرہ سے دور دراز کے علاقوں میں جا کر رہتے ہیں ' اور یہ مادی طور پر ترقی کے قطعی خواہش مند نہیں ہوتے اور صرف اس قدر پیدا کرتے ہیں کہ جو ان کی ضروریات کو پورا کر دے - اکثر ان میں نجی جائداد کا تصور نہیں ہوتا - کیونکہ یہ بغیر اشتراک کے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے - ان کے ہاں مادی ترقی سے زیادہ روحانیت پر زور ہوتا ہے -

اس کے علاوہ ہر مذہب میں دو رجحان رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں - ایک وہ جو مذہب کو اس کی اصلی تعلیمات کے مطابق برقرار رکھنا چاہتے ہیں - ان میں زیادہ تر متوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں - ان کے مقابلہ میں نچلے درجہ کے لوگ اور عوام ہوتے ہیں کہ جن کی زندگی میں محرومیاں اور مسائل ہوتے ہیں - اور وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ مذہب کی تعلیمات پر عمل کر سکیں - مثلاً امراء اپنی خواتین کو پردہ میں رکھ سکتے ہیں - اور ملازمت سے روک کر انھیں مردوں سے دور رکھ سکتے ہیں - مگر غریب عورتیں پردہ کی پابند نہیں ہو سکتیں کیونکہ انھیں روزگار کے لئے گھروں سے نکلنا اور محنت مزدوری کرنا ہوتا ہے - غریب لوگ عبادت کے فرائض پابندی سے اس لئے ادا نہیں کر سکتے کہ ان کے پاس محنت و مزدوری کی وجہ سے وقت نہیں ہوتا - وہ صدقہ و خیرات اور زکوۃ اس لئے نہیں دے سکتے کہ ان کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے - اس لئے غریبوں کا مذہب ان کی ضرورت کے مطابق تشکیل ہوتا ہے جس میں مزاروں پر جانا ' منتیں مانگنا ' نذر ' نیاز اور چڑھاوے چڑھانا شامل ہوتا ہے -

اس طرح ہر مذہبی فرقہ کے ماننے والوں کے پیشہ اور طرز زندگی سے ان کے مذہبی عقائد کا پتہ چلتا ہے - تاجر طبقہ جو اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں بے ایمانیاں کرتا ہے تو وہ ایسے فرقہ میں جاتا ہے کہ جہاں پیر ہو - کہ جس کی خدمت کرکے اور جسے نذر و نیاز دے کر وہ

گناہوں سے پاک وصاف ہو جائے' اور شفاعت کی ساری ذمہ داری اس کے پیر کی ہو جائے۔

ایک شخص کس طرح سے مذہب کو اپنی ضروریات کے مطابق بدلتا ہے۔ اس کی ایک مثال فتاوی کی تمام کتابوں میں "باب الحیل" سے ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کس طرح سے کسی مذہبی حکم کو حیلہ کے ذریعہ پورا کیا جائے۔ مثلاً اکبر بادشاہ کے صدر الصدور نے زکوٰۃ سے بچنے کا یہ حیلہ نکالا تھا کہ وہ سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنی ساری جائیداد اپنی بیوی کے نام کر دیتے تھے اور سال ختم ہونے پر واپس لے لیتے تھے۔ اس کی قسم کی بات اکثر سیٹھوں کے بارے میں کہی جاتی ہے کہ وہ زکوۃ کی رقم کو اناج کی بوری میں چھپا کر کسی غریب کو دیتے ہیں اور پھر وہ بوری اس سے خرید لیتے ہیں اس طرح کہ اس رقم کا پتہ اس غریب کو نہ ہو۔

وقت کے ساتھ ساتھ "باب الحیل" میں حیلوں کی تعداد اور طریقے بدلتے رہے۔ کیونکہ جب مذہب خود نہ بدلے تو اسے لوگ بدل لیتے ہیں۔ اور اسے بدل کر وہ اپنی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کر لیتے ہیں۔

اسلامی تاریخ کیا ہے؟

اسلامی تاریخ کی اصطلاح کو موجودہ دور میں یورپی مستشرقین اور محققین نے استعمال کرنا شروع کی - جب یورپی ممالک نے ایشیا افریقہ کے مسلمانوں کو اپنی نو آبادیات بنایا تو انھیں اس وقت اس سے دلچسپی ہوئی کہ جن لوگوں کو انھوں نے اپنی رعیت بنایا ہے ان کی تاریخ زبان - مذہب اور ثقافت کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جائیں - اس سلسلہ میں ان کے ہاں دو رجحانات تھے ایک تو سیاسی لوگوں کا جو اپنے سیاسی تقاضوں کے تحت ان ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کی مدد سے وہ انتظامی ضروریات کو پورا کر سکیں '

دوسرا رجحان مذہبی تھا جس کے تحت عیسائی مشنری ان ملکوں کی تاریخ ' زبان اور مذہب کے بارے میں جان کر عیسائیت کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے ' اس سلسلہ میں تاریخ ان کے لئے معاون ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے ذریعہ وہ مذہب کی کمزوریوں کا پتہ چلا سکتے تھے اور پھر ان پر موثر طور پر حملہ کر سکتے تھے -

یورپ کی یونیورسٹیوں میں ابتدائی محققین کا تعلق عیسائی مشنریوں سے تھا ' جو مذہبی نقطہء نظر سے تاریخ کے ذریعہ اسلام کی کمزوریوں کا مطالعہ کر رہے تھے ' اس لئے انھوں نے رسول اللہ کی شخصیت پر اعتراضات کئے ' اور پھر اسلام میں عورتوں کا درجہ - غلامی کے ادارے - اور اس قسم کی موضوعات پر کتابیں لکھیں - چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ کو ابتداء میں "محمڈن ازم" "محمڈن پیپلز" اور "محمڈن اسٹڈیز" کا نام دیا - کیونکہ اب تک بڑے بڑے مذاہب اپنے بانیوں کے ناموں سے مشہور تھے جیسے عیسائیت ' بدھ مت ' اور جین مت ' وغیرہ بعد میں جب اس پر اعتراض ہوا تو انھوں نے "اسلامی تاریخ" یا "مسلمانوں کی تاریخ" کی اصطلاح کو استعمال کرنا شروع کر دیا - بعد میں اس اصطلاح کو مسلمان جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے اختیار کر لیا ' اور جب جمال الدین افغانی کی پان اسلام ازم یا مسلم قومیت کی تحریکیں اٹھیں تو ان کے لئے یہ اصطلاح مفید ثابت ہوئی - اگرچہ تاریخ نویسی میں مسلمان مورخین نے کہیں بھی اسلامی تاریخ کی اصطلاح کو

استعمال نہیں کیا ہے بلکہ ہم عصر مورخوں نے اپنے عہد کو اس دور کے حکمران خاندان سے منسوب کیا ہے - ان میں یعقوبی - الطبری - المسعودی - ابن اثیر - ابن کثیر - اور ابن خلدون ان سب کی تاریخ حکمران خاندانوں کے نام سے ہیں - ان مسلمان حکمران خاندانوں کے زمانہ میں ان کی سلطنت میں صرف مسلمان ہی ان کی رعیت نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں عیسائی - یہودی - اور پارسی بھی شامل تھے اور جو بھی ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیاں ہوتی تھیں ان میں یہ سب مل کر حصہ لیتے تھے - عباسی دور حکومت میں جو یونانی سے ترجمہ ہوئے ان ترجموں کو کرنے والے زیادہ تر عالم عیسائی تھے - اسپین میں اس دور حکومت اور دوسرے خاندانوں کے زمانہ میں یہودی عالموں اور منتظمین کا دربار میں بڑا اثر و رسوخ تھا-

اسی طرح ان تمام ملکوں میں جہاں جہاں مسلمان حکمران خاندانوں نے حکومتیں قائم کیں ان کی تہذیب و ثقافت پر مقامی اثرات غالب آئے - شام و عراق میں بازنطینی - ایران میں قدیم ایرانی - اور چین و انڈونیشیا میں چینی - اس نے ان کے لباس - رسم و رواج - عادات - اور غذا کو تبدیل کر کے رکھ دیا-

اس وجہ سے اس پیچیدگی کو دور کرنے کے لئے عرب قومیت کے زیر اثر جو تاریخ لکھی گئی انھوں نے اُسے اسلامی کے بجائے "عرب دور" کہا - اور اس عہد میں جو فتوحات اور کامیابیاں ہوئیں تھیں اسے عربی تمدن میں شامل کر لیا-

جب عراق و شام اور مصر میں قدیم تہذیبوں کے آثار دریافت ہوئے تو ان کو اپنانے کے لئے ان میں قوم پرستی کے جذبات پیدا ہوئے - اور انھوں نے اب جو تاریخ لکھی وہ اپنی قوم کے شناخت کے لئے لکھی' اور اس کی جڑیں قدیم تہذیبوں میں تلاش کیں چنانچہ اہل مصر فراعنہ کی تہذیب پر نازاں ہیں اور عراقی میسوپوٹامیہ کی' اس طرح ایران قدیم کیانی اور ساسانی دور پر فخر کرتے ہیں - تاریخ کی اس نئی تشکیل میں عربوں کی فتوحات کو تاریخ کے ایک تسلسل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے - اور بعد میں انھوں نے تاریخ میں جو کارنامے سرانجام دئے وہ اسے اپنی قوم کے نام سے بیان کرتے ہیں - جیسے سلطنت عثمانیہ اور

سلطنت صفویہ کو ترک اور ایرانی قومی اور ملکی اعتبار سے دیکھتے ہیں اور ان کے لئے وہ اسلامی کا لفظ استعمال نہیں کرتے -

یہی صورت حال ہندوستان کی تاریخ کی ہے کہ اس میں مسلمان حکمراں خاندانوں کے عہد کو مسلم دور حکومت کہا جانے لگا جب خود اس دور کے مورخوں نے کہیں بھی اس عہد کو اسلامی یا مسلمان دور کے نام سے نہیں پکارا اور اسے غزنوی - غوری - خلجی - یا تغلق خاندانوں کے نام سے لکھا ہے - اور پھر ہندوستان میں تو اکثریت کبھی بھی مسلمانوں کی نہیں رہی - اور نہ ہی انھوں نے تمام ہندوستان پر حکومت کی -

اس طرح مغل دور حکومت کی اصطلاح بھی غلط العام ہو کر مشہور ہو گئی حالانکہ ان حکرانوں کا تعلق مغلوں سے نہیں تھا بلکہ نسلاً وہ ترک تھے - امیر تیمور کا تعلق برلاس قبیلہ سے تھا - یہ ضرور تھا کہ انھوں نے چنگیزی خاندان میں شادیاں ضرور کیں - مگر رہے یہ ترک - دراصل فرشتہ نے پہلی مرتبہ اس خاندان کو مغل کہا - مگر خود مغل مورخوں نے ان کے لئے اس لفظ کو کبھی استعمال نہیں کیا بلکہ انھیں "شاہان تیمور" کہا اور بعد کے مورخوں نے "شاہان چغتائیہ" کی اصطلاح کو بھی استعمال کیا ہے جو کہ غلط ہے - دراصل مغل کے لفظ کو مقبول بنانے میں یورپی سیاحوں کا بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے مغلوں اور ترکوں میں زیادہ فرق محسوس نہیں کیا اور انھیں "گریٹ مغول" کہہ کر ان کی دولت اور شان و شوکت کے وہ تذکرے کئے کہ آج یہ لفظ اس کی علامت بن گیا ہے اور اس طرح یہ خاندان مغل ہو گیا - ستم ظریفی یہ ہے کہ بابر ان مغلوں سے جو اس کی فوج میں تھے بڑا نالاں تھا اور اپنی توزک میں اس نے انھیں جاہل اور غیر مہذب کہا - اور یہی نام اس کے خاندان کے لئے باعث عزت ہو گیا ہے -

اس لئے سلاطین اور مغلوں کے عہد کو اسلامی دور کہنا ایک تاریخی غلطی ہے کیونکہ دونوں ادوار کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت مختلف رہی ہے اور انھوں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کا دور اسلامی ہے -

اس نقطہ نظر سے اسلامی فن تعمیر - اسلامی مصوری اور اسلامی موسیقی - وغیرہ کی

اصطلاحات تاریخی اعتبار سے غلط ہیں - کیونکہ ہر ملک کی تہذیب و تمدن اس کے جغرافیائی ماحول و آب و ہوا - اور سیاسی و معاشی حالات کے تحت جداگانہ طور پر ہوئی - اس لئے ان مختلف ادوار کو اس طرح ملا دینا تاریخ کے عمل کو سمجھنے میں ایک فاش غلطی کا ارتکاب ہے - تاریخ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر علاقہ کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ اکائی کی صورت میں کیا جائے - اس سے اس کے ارتقاء اور ترقی کا پتہ چلے گا -

تاریخ اور قوموں کا ملاپ

تاریخ میں قومیں، قبیلے، اور گروہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں ہجرت کر کے آباد ہوتے رہے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ جب زمین زیادہ ہوا کرتی تھی، ذرائع کی کمی نہ تھی۔ تو اس وقت ان گروہوں اور جماعتوں میں تصادم کم ہوا کرتے تھے۔ مگر جب کسی ایک قبیلے نے جنگلوں کو صاف کر کے اسے قابل کاشت بنایا اور وہاں رہنا شروع کیا۔ اب اگر کسی دوسرے قبیلے نے اس پر قبضہ کی کوشش کی تو پھر مقابلہ سخت اور خوں ریز ہوا۔ یہی صورت حال آگے چل کر قوموں، ملکوں، اور سلطنتوں کے ساتھ پیش آئی کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس پر دوسرا قابض ہو۔ لیکن دوسری طرف فطرت و سماوی اور سماجی و معاشی وجوہات تھیں کہ جو قوموں اور مختلف گروہوں کو نئے علاقوں کی جانب جانے پر مجبور کر رہیں تھیں اور اس صورت میں ان میں اور مقامی باشندوں میں تصادم ہوتا تھا۔

اگر مقامی باشندے کمزور ہوتے تو اس صورت میں نئے آنیوالے ان کا قتل عام کر کے ان کا صفایا کر دیتے تھے تاکہ اس کے بعد وہ بلا شرکت غیرے ان کی زمینوں پر قابض ہو جائیں۔ امریکہ، آسٹریلیا، اور نیوزی لینڈ میں یہی ہوا کہ انھیں مار مار کر ان کی تعداد اس قدر کم کر دی کہ وہ سفید فام اقوام سے مزاحمت کرنے کے قابل نہیں رہے۔ اس کے نتیجہ میں خون ریز جنگیں ہوئیں، اور بالآخر انھیں اپنی زمین اور ذرائع میں انھیں شریک کرنا پڑا۔

جب قتل و غارت گری کا دور ختم ہوتا ہے تو اس کے بعد جو مرحلہ آتا ہے اس میں مقامی باشندوں اور نئے آنے والوں میں میل ملاپ شروع ہوتا ہے۔ باہمی تجارت اور نظریات و خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے اور مفاہمت کی فضا تیار ہوتی ہے۔

ہندوستان میں جب آریہ آئے تو ابتداء ان کا مقابلہ ہندوستان کی قدیم اقوام اور قبیلوں سے ہوا۔ یہ تصادم انتہائی خون ریز اور سخت تھا کہ جس میں آریاؤں نے دراوڑین نسل کا خاتمہ کر دیا اور انھیں برابر پیچھے کی جانب دھکیلتے رہے۔ مگر جب جنگ و جدل کا دور

ختم ہوا اور روایات نے ایک دوسرے کو متاثر کیا- مذہبی اور فلسفیانہ نظریات نے ہم آہنگی کے مکاتب فکر کو فروغ دینا شروع کیا- مثلاً جب آریہ ہندوستان میں آئے تو ان کا معاشرہ پدری تھا کہ جس میں مرد کو عورت پر فوقیت تھی اور ان کے تمام دیوتا مرد تھے' مگر دراوڈین تہذیب پر مادرانہ معاشرہ کے اثرات غالب تھے اور ان کے مذہب میں دیویوں کا بلند مرتبہ تھا- بعد میں جب ملاپ کا عمل شروع ہوا تو اس میں آریہ دیوتاؤں کی شادیاں دراوڈین دیویوں سے ہونے لگیں- لکشمی' درگا' کالی' اور پاروتی کو بڑا درجہ مل گیا- یہاں تک کہ کالا کرشن ہندو معاشرہ کا عظیم اور محبوب دیوتا بن گیا- کرشن جی مہاراج کی حیثیت اس پل کی ہے کہ جس نے کالے اور سفید رنگ کو ملا دیا- جنوبی ہندوستان آگے چل کر ہندومت کا مضبوط گڑھ بن گیا- کہ جہاں وید کی روایات کا تحفظ کیا گیا- اور اس سے شنکر اچاریہ کا ویدانت فلسفہ اور بھگتی تحریک کی ابتداء ہوئی-

ملاپ کے اس عمل میں ایک طویل عرصہ لگا- کیونکہ دو متضاد ثقافتوں کے ہم آہنگ ہونے میں وقت درکار ہوتا ہے- ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے ذہن کو تبدیل کرنا ہوتا ہے- اس عمل میں دونوں ثقافتیں اپنا ایک بڑا حصہ قربان کرتی ہیں- کیونکہ وہ تمام روایات اور ادارے جو اس ملاپ میں رکاوٹ بنتے ہیں انہیں ختم کرنا ہوتا ہے- اس کے نتیجہ میں عقائد بدلتے ہیں روایات بدلتی ہیں رسم و رواج بدلتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ایک نیا قومی مزاج بنتا ہے- یہ ایک ارتقائی عمل ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ آگے کی جانب بڑھتا ہے- پہلے اس عمل میں اس لئے بھی دیر ہوئی تھی کہ ذرائع آمد و رفت کی کمی تھی- نظریات زبانی اور سینہ بہ سینہ پھیلتے تھے- مگر ان تمام باتوں اور رکاوٹوں کے باوجود ایک مشترکہ ہندوستان ثقافت کی تشکیل ہوئی جو آریاؤں اور دراوڈین عناصر مبنی تھی

ہندوستان میں آریاؤں کے بعد بھی مختلف اقوام آئیں کہ جن میں شاکا' کشن' پارتھی' اسکاتھی' ہن' یونانی اور منگول تھے' مگر ان کا دائرہ اثر صرف شمال مغرب کی سرحدوں اور شمالی ہندوستان تک محدود رہا- اور یہ یہیں پر جنگ و جدل کے بعد' ختم ہو گئے- اس وجہ سے شمالی مغربی سرحدی علاقے میں ذات پات کا نظام اتنا سخت نہیں رہا' اور عورت کو نسبتاً زیادہ

آزادی حاصل رہی۔

جب ترک اور افغان ہندوستان میں آئے تو یہ ہندوستان کے معاشرہ کے لئے کوئی حادثہ نہیں تھا' کیونکہ اس سے پہلے یہاں غیر ملکی قومیں آتی رہی تھیں۔ اور محمود غزنوی کے حملوں سے لے کر شمالی ہندوستان میں ان کے آباد ہونے تک دو سو سال کا عرصہ ہے کہ جس میں ہندوستان کے لوگ ان سے مانوس ہو چکے تھے۔ اور انہیں بحیثیت سیاسی طاقت کے روکنے کے لئے راجپوتوں نے ان سے سخت اور خون ریز مقابلے کئے۔ ان مقابلوں میں کامیابی کے بعد ہی ترک اور افغان یہاں پر اپنی بستیاں بسا کر آباد ہو سکے۔

بعد میں جب مغل ایک علیحدہ نسلی جماعت کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو اس مرتبہ ان کو روکنے کے لئے راجپوت اور افغان دونوں متحد ہو گئے۔ پانی پت اور کنواحہ کی جنگوں میں دونوں مغلوں کے خلاف ساتھ ساتھ لڑے کیونکہ مغلوں نے ان دونوں کے مفادات کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح تاریخ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ دو قومیں جو ایک ہی ملک میں برسرپیکار رہتی ہیں جب ایک تیسرا دشمن ان کے ذرائع پر قابض ہونے کے لئے جاتا ہے تو وہ اس کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں۔ مغلوں کی کامیابی کے بعد راجپوتوں اور افغانوں کو ان کے لئے جگہ چھوڑنی پڑی۔ اور اس طرح وہی عمل پھر دھرایا گیا۔ خون ریز جنگیں پھر ثقافتی میل ملاپ کہ جس کے نتیجہ میں ایسی تحریکیں ابھریں کہ جنہوں نے ہندوستان کے لوگوں کو مذہب' رنگ و نسل' اور ذات پات سے بلند ہو کر ملانے کا عزم کیا۔ شمالی ہندوستان کی بھگتی تحریک اور صوفیاء کا وحدت الوجود کا فلسفہ اسی کی ایک کڑی ہے

ہندوستان میں سب سے آخر میں آنے والی یورپی اقوام تھیں۔ یہ بھی اپنے ابتدائی دور میں ہندوستان کی ثقافت میں ختم ہو گئیں۔ کیونکہ ابتداء میں ایک تو ان کی تعداد کم تھی۔ اور یہ بحیثیت تاجر آئے تھے۔ فاتح کے نہیں۔ مگر جیسے جیسے ان کا اقتدار بڑھتا گیا اس طرح وہ ہندوستان کے معاشرہ سے علیحدہ ہوتے چلے گئے۔ اور مکمل سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مغربی ثقافت کو پوری طرح نافذ کرنے کی کوشش کی مگر خود کو ہندوستانیوں سے دور رکھا۔ کنٹونمنٹ اور سول لائنز کے علاقے بنا کر وہاں اپنی رہائشیں

علیحدہ کیں اپنی زبان، غذا اور لباس جدا رکھا۔ شادی بیاہ اور ثقافتی رسومات میں خود کو شریک نہیں کیا

ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کو شروع ہی سے اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کا خیال تھا اور اس احساس نے اسے ہندو معاشرے میں ضم نہیں ہونے دیا۔ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یہ خود کو خطرے میں سمجھتے تھے اور اس لئے شناخت قائم رکھنے کے لئے خود کو متحد رکھنا ضروری سمجھتے تھے کہ ان کا تحفظ ہو سکے اس شناخت کو برقرار رکھنے میں علماء نے عملی طور پر حصہ لیا۔ جس کی وجہ سے معاشرہ میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان معاشرہ میں قدامت پسندی کی روایت مضبوط ہوتی چلی گئیں ۔ ہر نئی چیز کی اس لئے مخالفت کی گئی تاکہ ان کی شناخت جن روایات پر قائم ہے وہ برقرار رہیں اور اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو جائے ۔ اس لئے علماء برابر ہندو رسومات کے خلاف وعظ کرتے رہے اور انہیں اپنانے سے روکتے رہے ۔ یہی رجحان اس وقت بھی تھا کہ جب یورپی تعلیم و ثقافت کو اس رد کر دیا گیا کہ اس کو اپنانے سے مسلمان اپنی شناخت کھو دیں گے ۔ جب کسی بھی قوم اور معاشرہ میں تشخص کا مسئلہ اس شدت کے ساتھ ہو تو پھر قوموں میں طلاپ کا عمل رک جاتا ہے اور تعصبات جڑ پکڑ لیتے ہیں ۔ حالانکہ تشخص ایک ٹھہری ہوئی چیز نہیں بلکہ قوموں کی زندگی میں ایک بدلتے ہوئے عمل کا نام ہوتا ہے ۔ جو روایات آج تشخص کی علامت ہیں کل وہ بدل جاتی ہیں ۔ اور دوسری روایات ان کی جگہ لے لیتی ہیں ۔ اگر اس عمل کو روکا جائے تو پھر معاشرہ منجمد ہو کر اپنی جگہ ٹھہر جاتا ہے

تاریخ کا خاتمہ

آج کل یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ کیا کوئی ایسا وقت آئے گا کہ جب تاریخ کا خاتمہ ہو جائے گا؟ مذہبی نقطئہ نظر سے تو اس سوال کا جواب اس طرح سے دیا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی کہ جس میں انسان مصروف عمل ہے اس کی ابتداء اور انتہا ہے اور وقت آئے گا کہ جب یہ کائنات اور انسان ختم ہو جائیں گے - اور اس کے ساتھ ہی تاریخ کا بھی خاتمہ ہو جائے گا - اس کے بعد دوسری دنیا میں جو زندگی ہوگی - وہ تمام تضادات سے خالی ہوگی - اور اس میں ہر انسان کو وہ سب کچھ ملے گا جو اس کی خواہش ہوگی - اس لئے اس دنیا میں تاریخ کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوگی - کیونکہ وہ تمام قوتیں جو تاریخ ساز ہیں وہاں ان کا وجود ہی نہیں ہوگا -

اس کے علاوہ مذاہب میں تاریخ کے خاتمہ کا ایک اور تصور بھی ہے - وہ یہ کہ ہر مذہب نے اپنے ابتدائی زمانہ میں مذہب کی تعلیمات و عقائد کے مطابق ایک مثالی معاشرہ قائم کیا تھا، لیکن بعد میں یہ معاشرہ برابر خراب ہوتا چلا گیا اور اس کی پاکیزگی پر دھبے پڑتے چلے گئے - اس نئے تاریخی عمل نے معاشرہ کو بگاڑا اور خراب کیا - اس وجہ سے وہ بعد کی تاریخ کو اپنے لئے خراب اور مہلک سمجھتے ہیں اور تاریخ کا خاتمہ اس مثالی معاشرہ کے قیام کے بعد خیال کرتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب کے ماننے والوں میں احیاء کا نظریہ بڑا مقبول ہے - اور وہ واپس لوٹ کر اس مثالی معاشرہ کے قیام کی جدوجہد کرتے ہیں - اور اس تاریخی عمل کو بالکل مٹا دینا اور بھلانا چاہتے ہیں کہ جو اس میں اور ان کے عہد کے درمیان حائل ہے -

ایک اور نقطئہ نظر سے تاریخ انسان اور فطرت کے درمیان تصادم اور کش مکش کا نام ہے - جب سے یہ کش مکش شروع ہوئی ہے انسان اس میں برابر فطرت پر غالب آ رہا ہے اور ایک دن وہ آئے گا کہ جب وہ مکمل طور پر فطرت پر غالب آ جائے گا - جب تصادم کا یہ ڈرامہ ختم ہو گا تو پھر تاریخ کے پاس بیان کرنے کو کچھ بھی نہیں رہ جائے گا اور وہی نقطہ تاریخ کے خاتمہ کا ہو گا

مارکسی نقطہ نظر سے تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے کہ جس میں انسانی سماج مختلف درجوں سے گزرتا ہوا - آخر کمیونزم کے عہد میں داخل ہو گا - اس وقت انسانی سماج کے تمام تضادات ختم ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ تاریخ کا خاتمہ ہو جائے گا - لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو گا کہ جب کمیونزم پوری دنیا پر غالب آجائے گا - ورنہ دوسری صورت میں کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ معاشروں میں جدوجہد جاری رہے گی -

انسانی تاریخ میں تاریخ کے خاتمہ کے نظریات دنیا کی ہر قوم اور تمدن کے لئے جدا جدا ہیں - تاریخ میں کوئی قوم یا تمدن اس وقت زندہ رہتا ہے جب تک کہ وہ باعمل ہوتا ہے' اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کرتا ہے - لیکن جب یہ تمدن اپنی تخلیقی صلاحیتیں کھو دیتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے - تو اس نقطہ پر پہونچ کر اس تمدن کی موت واقع ہو جاتی ہے - اور اس کی موت کے ساتھ ہی اس کی تاریخ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے - مثلاً یونانیوں نے اپنے دور میں علم و ادب و فلسفہ' سائنس اور فنون میں جو تخلیقی کارنامے سرانجام دئے - ایک خاص مرحلہ پر آکر ان کی تمام توانائی ختم ہو گئی - اور اسی کے ساتھ یونانی تمدن کی تاریخ کا خاتمہ ہو گیا - حالانکہ یونانی قوم ابھی بھی زندہ ہے - مگر اس کے تمدن کی تاریخ کا خاتمہ ہو چکا ہے - حالانکہ یونانی قوم ابھی بھی زندہ ہے - مگر اس کے تمدن کی تاریخ ختم ہو چکی ہے - یہی کچھ رومیوں' اور عربوں کے ساتھ ہوا اور یہی تاریخ قدیم تمدنوں کی ہے جن میں ہندوستان مصر' عراق' اور ایران شامل ہیں -

تاریخ کی ابتدا اور انتہا ہر قوم کی اپنی جداگانہ ہوتی ہے - آج کی دنیا میں بہت سی اقوام ہیں کہ جو کہ دنیا کی تاریخ میں باعزت مقام حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ان میں اہل فلسطین جنوبی افریقہ کے سیاہ نام باشندے' کرد اور آرمینی ہیں کہ جو اپنے وطن اور حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں - یہ لوگ تاریخ کی تشکیل کر رہے ہیں - تاریخ کو بنانے میں معروف ہیں شاید جب یہ اپنے مقاصد کو حاصل کر لیں تو اس وقت ان کے لئے تاریخ کا خاتمہ ہو جائے - مگر اس کے بعد ان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو گا کہ جس میں یہ

اپنے وطن کی تاریخ بنائیں گے

تاریخ کے خاتمہ کا یہ نعرہ آج مغربی تہذیب و تمدن کی جانب سے لگایا جا رہا ہے - ان کا خیال ہے کہ وہ تکمیل کے مراحل پر پہونچ گئے ہیں - اور آج اس جگہ پر ہیں کہ جہاں انہوں نے فطرت پر بھی برتری حاصل کر لی ہے - اور اپنی ذہانت سے سائنس و سماجی علوم میں بھی بلندیوں کو چھو لیا ہے - اس لئے اب ان کے مقابلہ میں اور کوئی تہذیب اور تمدن نہیں رہا اس لئے وہ اس کا دعوی کر رہے ہیں کہ ان کے لئے تاریخ کا خاتمہ ہو گیا - مگر تاریخ کا خاتمہ کا یہ نعرہ دنیا کے پس ماندہ ملکوں اور مظلوم اقوام اور طبقوں کے لئے زہر قاتل ہے - کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سمجھوتہ کی ضرورت ہے' اور ہر بات کو برداشت کرنا چاہئے کیونکہ تاریخ ختم ہو چکی ہے - مگر ان پس ماندہ ملکوں اور اقوام کی تاریخ ختم نہیں ہوئی - ان کی تاریخ ان کی جد و جہد کے ساتھ جاری رہے گی

اور شاید تاریخ کا کبھی خاتمہ نہ ہو - کیونکہ اس کا تعلق انسان سے ہے - اور انسان کی فطرت میں جو جدت ہے - جو بو قلمونی ہے وہ اسے ہمیشہ با عمل رکھے گی - نئے تضادات ابھرتے رہیں گے اور انسانی صلاحیتوں کو چیلنج کرتے رہیں گے - اور اس طرح اسے معروف عمل رکھیں گے - اور اس کے اس عمل سے تاریخ برابر بنتی رہے گی اور آگے بڑھتی رہے گی - انسان اور انسانی معاشرہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی برابر بدلتی رہے گی -

مزدوروں کی تاریخ کیسے لکھی جائے؟

کلاسیکی سوشل ازم میں مزدور' انقلاب کی علامت ہے - مگر اس میں اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ مزدور جن حالات میں گھرا ہوتا ہے اور جن روایات میں جکڑا ہوتا ہے - اس کے لئے یہ مشکل ہوتا ہے کہ وہ استحصالی قوتوں کو سمجھ سکے - اس لئے اس میں سیاسی شعور پیدا کرنے کا کام دانشوروں اور مفکروں کا ہوتا ہے - جو یہ کام ایک انقلابی پارٹی تشکیل کر کے کرتے ہیں - اس نظریہ کے تحت ٹریڈ یونین تنہا سوشل ازم کے لئے نہیں لڑ سکتی ہے' اس کا دائرہ کار بڑا محدود اور تنگ ہوتا ہے - وہ مزدوروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے انہیں متحد کرتی ہے' ان میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہے اور بحیثیت ایک طبقہ کے ان میں شناخت پیدا کر کے - ان کا انقلابی ذہن بناتی ہے اور انہیں اس جدوجہد کے لئے تیار کرتی ہے کہ جو وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کرنے والے ہیں - مگر وہ تنہا انقلاب نہیں لا سکتے -

اس کا ایک نقطہ نظر یہ تھا کہ مزدوروں کی جو تاریخ لکھی گئی وہ بڑی محدود اور تنگ تھی - اس میں مزدوروں کی جدوجہد اور ان کی سرگرمیوں کو صرف ٹریڈ یونین تک محدود کر دیا گیا اور تاریخ کو لکھتے وقت جن موضوعات پر زور دیا گیا وہ یہ تھے کہ ٹریڈ یونین نے کن مرحلوں پر ہڑتالیں کرائیں - کون سے مطالبات پیش کئے اور ان میں کس حد تک انہیں کامیابی ہوئی - یونین میں کتنی مختلف ٹکڑیاں تھیں - ان کے اختلافات کیا تھے؟ کون کون لیڈر ان کی راہنمائی کر رہے تھے، ان کے نظریات کیا تھے؟ انہیں کس طرح اور کیسے بحرانوں میں مزدوروں کی قیادت کی، وغیرہ - اس قسم کی تاریخ نے مزدوروں کو صرف ٹریڈ یونین اور اس کی سرگرمیوں تک محدود کر دیا اور اسے باقی معاشرہ سے بالکل کاٹ کر رکھ دیا یہ تاریخ پڑھتے ہوئے - یہ احساس ہوتا ہے کہ مزدور باقی لوگوں سے جدا کوئی اور مخلوق ہے اور اس طرح ان کی جدوجہد بھی معاشرہ کی جدوجہد سے کٹ جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مزدوروں کا تعلق دوسرے طبقوں سے بالکل نہیں اور وہ خود غرضانہ طور پر صرف اپنے مفادات کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہیں - اس تاریخ نے مزدور کے انقلابی کردار کو مسخ کر کے رکھ دیا اور اس کی جدوجہد کو صرف تنخواہوں کے اضافہ یا الاؤنس کی منظوری تک محدود کر دیا - جب مزدوروں کی تاریخ کو اس انداز میں لکھا گیا تو اس سے معاشرے کے دوسرے طبقوں کو کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی - کیونکہ اس تاریخ میں انہیں اپنا کوئی کردار اور عمل نظر نہیں آیا، اس لئے اس تاریخ کے اثرات بھی محدود ہو کر رہ گئے -

جن لوگوں نے مزدور تحریکوں میں حصہ لیا تھا اور جو مزدور تحریک کو عوامی تحریک سے ملا کر دیکھنا چاہتے تھے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مزدور تاریخ کو ایک نئے انداز اور نقطہ نظر سے لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس میں صرف ایک طبقہ کی جھلک نہ ہو بلکہ اس میں پورا معاشرہ سرگرم عمل ہو - اس لئے اس بات پر زور دیا گیا کہ مزدوروں کی تاریخ لکھتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ایک مزدور کی روزمرہ کی زندگی اور اس کے ٹریڈ یونین کی

ممبر شپ میں کیا رشتہ اور تعلق ہے - معاشرہ میں جو تبدیلیاں آتی ہیں اس کا اس کی زندگی اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر کیا اثر پڑتا ہے - یعنی مزدور کو معاشرہ کے اندر سے دیکھا جائے - اس سے اسے علیحدہ نہیں کیا جائے -

اور سب سے بڑی بات یہ کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مزدور کو مورخ اپنی نظر سے نہیں دیکھے اور نہ ہی اپنے نقطہ نظر سے اس کی ذات اور زندگی کا تجزیہ کرے - بلکہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ مزدور خود کس طرح سے سوچتے ہیں - ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف ان کا رد عمل کیا ہوتا ہے' وہ اپنے غصہ کا اظہار کس طرح سے کرتے ہیں اور وہ کون سے حالات ہوتے ہیں کہ جب انہیں اپنی طاقت کا احساس ہوتا ہے - اگر تاریخ کو اس طرح سے لکھا جائے گا تو وہ مزدور تحریک کا زیادہ جامعیت کے ساتھ تجزیہ کر سکے گی - اور اس تاریخ سے عملی طور پر سیکھا جا سکے گا -

مختلف سیاسی راہنما جنھوں نے مزدور تحریکوں میں حصہ لیا' انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کے بعد اس کی نشان دہی کی کہ مزدوروں میں اپنے مفادات کا احساس بڑا شدید ہوتا ہے اور وہ ان کے حصول یا ان کے تحفظ کے لئے آزادانہ طور پر جدوجہد کرتے ہیں - اس جدوجہد سے ان میں جو شعور آتا ہے وہ کوئی ٹریڈ یونین یا سیاسی جماعت پیدا نہیں کر سکتی ہے مثلاً جب بھی Mass اسٹرائیک ہوتی ہے تو اس کے ذریعہ مزدور ایک انقلابی صورت حال کو پیدا کرتے ہیں ان کی روزمرہ کی زندگی میں جو ایک خاموشی ہوتی ہے - اس خاموشی میں چھپی طاقت و قوت کا اظہار ماس اسٹرائیک کے ذریعہ ہوتا ہے - اگر کوئی ٹریڈ یونین یا سیاسی جماعت نہ بھی ہو تو وہ اپنی جدوجہد کو جاری رکھ سکتے ہیں - اس لئے انقلابی دانشور اور مفکروں کا کام یہ نہیں کہ وہ ان کی تربیت کریں یا انہیں باشعور بنائیں بلکہ ان کا کام تو یہ ہے کہ خود ان سے سیکھیں اور اپنے نظریات کو مزدوروں کی ضرورت کے مطابق ڈھالیں اور تبدیل کریں - کیونکہ مزدوروں میں شعور باہر کی قوتوں سے پیدا نہیں ہوتا - یہ

شعور ان کے اندر ہوتا ہے اور ان کی اپنی جدوجہد سے یہ بیدار ہوتا ہے اور پختگی تک پہونچتا ہے - اس لئے وہ کسی دانشور اور انقلابی پارٹی کے محتاج نہیں ہوتے -

مزدور کو معاشرہ سے کاٹ کر علیحدہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ' وہ بھی معاشرہ کا ایک حصہ ہوتا ہے اور اس حیثیت سے اس کے شعور کی راہ میں بھی وہ ساری مشکلات ہوتی ہیں جو کہ دوسرے طبقوں اور گروہوں کو درپیش ہوتی ہیں - ان میں وہ تمام ادارے ' روایات ' اور اقدار آجاتی ہیں جو کہ معاشرے کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں - ان میں قانون کا احترام ' ملک سے محبت ' خاندانی ماحول وغیرہ شامل ہیں - جب بھی ایک انسان انفرادیت حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہ تمام ادارے اور روایات اس کی راہ میں رکاوٹیں بن جاتے ہیں - کیونکہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ اگر وہ ان روایات و اقدار کی پابندی کریں گے تو انہیں اس کا صلہ ملے گا - بچہ اگر ماں باپ کی اطاعت کرے گا تو اس کے بدلہ میں اسے تحفظ ملے گا بیوی اگر شوہر کی وفادار ہوگی تو اس کے بدلہ میں اسے معاشی اطمینان حاصل ہوگا - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن ان روایات کو قبول کر لیتا ہے اور اس میں ان کے اندر چھپی ہوئی استحصالی قوتوں کا احساس نہیں ہوتا اور وہ ان کے خلاف رد عمل کے بجائے ظاہری چیزوں کے خلاف ہو جاتے ہیں اور ان پر اپنے غصہ کا اظہار کرتے ہیں - اسی لئے مزدوروں کی ابتدائی جدوجہد مشینوں کے خلاف تھی - کیونکہ انکا یہ خیال تھا کہ مشین ان کی جگہ لے کر انہیں بے روزگار کر رہی ہے - اور اسی ذہنیت کا مظاہرہ آج کل ٹکنالوجی کے خلاف ہے - حالانکہ قصور نہ مشین کا تھا اور نہ ٹکنالوجی کا ہے بلکہ اس نظام کا ہے کہ جس نے مشین کو اپنے لئے استعمال کیا اور آج ٹکنالوجی کو استعمال کر رہا ہے - مشین اور ٹکنالوجی نے مزدور کو فرصت اور آرام دینے کے بجائے اس کے دکھوں میں اضافہ اس لئے کیا کہ وہ اس نظام کے اندر کام کر رہی ہے کہ جس میں پیداوار پر کنٹرول مزدور کے ہاتھ میں نہیں ' اس لئے اصل غصہ مشین یا ٹکنالوجی پر نہیں آنا چاہئے بلکہ اس کے پس منظر میں چھپی جو استحصالی قوتیں ہیں ان کے خلاف کرنا چاہئے -

معاشرہ کو تبدیل کرنے کی ذمہ داری نہ صرف مزدور ہی کی نہیں اس میں دوسرے محروم طبقوں کی شرکت بھی لازمی ہے اور جب تک ان سب کی جدوجہد کو ملایا نہیں جائے گا اس وقت تک ان کی قوت بکھری ہوئی رہے گی اس لئے مزدوروں کی تاریخ جب لکھی جائے تو انہیں معاشرہ سے کاٹ کر نہیں دیکھا جائے اور جب ان کی جدوجہد ہو تو اسے دوسرے محروم طبقوں کی جدوجہد سے ملایا جائے' اسی صورت میں معاشرہ میں تبدیلی آسکے گی۔

تاریخ کا ادراک

ماضی کے علم سے انسانی کے حال پر کیا اثرات ہوئے اور اس سے اس فکر اور ثقافت کس حد تک متاثر ہوئی؟ یہ تھے وہ سوالات کہ جنھوں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں تاریخی انقلاب کو پیدا کیا- اور اس سے انسانی ذہن میں جو تبدیلیاں آئی- فکر اور سوچ کی جو نئی راہیں کھلیں اس نے انسانی تاریخ اور انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دی- کیونکہ اس انقلاب سے پہلے تاریخ کا مضمون بنیادی حیثیت کا حامل نہیں تھا- بلکہ اسے مذہب کے تابع سمجھا جاتا تھا یا اس کے ذریعہ نسلی و قومی جذبات کو ابھارا جاتا تھا- مگر جب تاریخ کو ایک آزاد اور خود مختار حیثیت دی گئی تو اس وقت یہ ممکن ہوا کہ انسانی تاریخ کو حقیقی طور پر سمجھا جا سکے'

انسانی ذہن کو اس وقت تک مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا- جب تک کہ انسانی تہذیب کے ارتقاء کو مرحلہ بہ مرحلہ نہیں سمجھا جائے گا اور جب تک بکھری ہوئی کڑیوں کو ملایا نہیں جائے گا اس وقت تک انسانی ترقی کے سلسلہ کو جوڑا نہیں جا سکے گا-

انسان کے تمام کارناموں- اس کے افکار و نظریات کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا' جب تک کہ اس کی تاریخ معلوم نہ ہو' صرف تاریخ کے ذریعہ اس کا اندازہ ہوتا ہے ماضی میں کن مرحلوں' راستوں' اور دستواریوں سے گذر کر کوئی نظریہ' یا ایجاد تکمیل تک پہونچی- کیونکہ تاریخ کا یہ کام ہے کہ کسی چیز کی بنیاد تک جائے- اس کی ابتداء کو ڈھونڈے اور جب تاریخ یہ سفر کرتی ہے تو وہ ایک ڈرامہ بن جاتی ہے اور زمانہ قدیم سے لے کر زمانہ حال تک جو جو تبدیلیاں آئی ہیں' تغیرات ہوئے ہیں یا پھیلاؤں ہوئے ہیں وہ ان رازوں سے ایک کے بعد ایک پردہ اٹھاتی چلی جاتی ہے- تاریخ وقت کی تہوں کو ہٹاتی جاتی ہے اور جب بھی کسی راز سے پردہ اٹھتا ہے تو اس کے ساتھ انسانی ذہن روشن ہوتا چلا جاتا ہے- یہی وہ چیز ہے کہ جسے تاریخی شعور کہا جاتا ہے اور اسی تاریخی شعور کے نتیجہ میں دلوں سے نفرت و تعصب و تنگ نظری دور ہوتی ہے' ذہن کو سوچ اور فکر کی نئی روشنی ملتی ہے' اور انسان

میں یہ فہم پیدا ہوتا ہے کہ وہ تاریخ میں مختلف قوموں اور معاشروں کی روایات اور اداروں کو سمجھ سکے۔

ہمیں آج کے دور میں تہذیب کی اہمیت کا احساس اسی وقت ہو گا کہ جب ہمیں ماضی کے بارے میں پوری پوری معلومات ہوں گی۔ کیونکہ صرف تاریخ کے ذریعہ ماضی اور حال کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے۔

ہمارے تاریخی شعور کی کمی اور پختگی کی علامت یہ ہے کہ جب ہم پرانے سائنسدانوں، مفکروں، اور فلسفیوں کی ایجادوں، نظریات اور افکار کو جدید دور کے علم اور روشنی میں دیکھتے ہیں تو وہ انتہائی بچگانہ اور مضحکہ خیز لگتی ہیں۔ لیکن اگر ہم تاریخ کی روشنی میں انہیں چیزوں کو ایک تسلسل کے ساتھ دیکھیں تو ان کی اہمیت نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے قدیم ایجادوں، افکار اور اداروں کو سمجھنے کے لئے تاریخی شعور کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ بغیر اس کے ان کی اہمیت پوری طرح سے ثابت نہیں ہوتی ہے۔

اگر تاریخی علم نہ ہو تو اس صورت میں کسی ایجاد یا فن کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ چیز ایک راز بن کر معمہ کی شکل میں رہ جاتی ہے۔ مثلاً آج اہرام مصر تو موجود ہیں مگر ان کا علم موجود نہیں، مصر کی ممیاں تو باقی رہ گئیں مگر ان کو بنانے کا فن زمانہ سے مٹ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان چیزوں کے اردگرد ایک پراسراریت آ گئی ان کو دیکھ کر ایک تحیر کا احساس تو پیدا ہوتا ہے مگر ان کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی ہے اور اس وجہ سے ہم اس عہد کے انسانی ذہن، اس کی ترقی اور اس کی تخلیقی قوت سے بے خبر رہتے ہیں۔ اگر ماضی کا تمام علم محفوظ رہتا تو انسان کی ترقی میں بڑی آسانیاں ہوتیں۔ جب وقت کے ہاتھوں علم فنا ہو جاتا ہے تو انسان کو اسے دوبارہ سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دریافت کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ علم ختم ہو جاتا ہے اور وہ دوبارہ سے دریافت بھی نہیں ہو سکتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کچھ عرصہ ہوا کہ اخبارات میں یہ خبر آئی کہ تیونس میں پانی کی ایک گھڑی دریافت ہوئی کہ جو وقت کے ساتھ بیکار ہو گئی تھی، اور اب تیونس کے

لوگوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس گھڑی کی تکنیک سے واقف ہوتا اور اسے مرمت کر کے دوبارہ اسے چلنے کے قابل بناتا - یہ گھڑی قرون وسطیٰ میں کسی ماہر نے بنائی تھی بعد میں سیاسی انقلابات اور بحرانوں نے اس فن کو اس طرح ختم کیا کہ اب اس کے جاننے والے باقی نہیں بچے - اس طرح حادثات وواقعات تہذیبی ترقی کو رد کر دیتے ہیں - اور معاشرے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی جانب جا کر پس ماندہ ہو جاتے ہیں -

یہ تاریخ کا کام ہے کہ وہ تاریخی سے تسلسل کو قائم رکھے - اور دریافت شدہ علم کو محفوظ رکھے - اسی صورت میں انسانی تہذیب و تمدن مستحکم ہوں گے اور تاریخ ان کی رفتار کو باقی رکھ سکے گی -

تاریخ قوموں کے ذہن کی عکاسی کرتی ہے - تاریخ میں کسی قوم کی خواہشات ' تمنائیں اور آرزوئیں چھپی ہوتی ہیں - اس میں اس کی ضروریات ہوتی ہیں - اس کے ناکام منصوبے ہوتے ہیں - اس کے خیالات و افکار ہوتے ہیں - تاریخ نہ صرف ماضی کے رازوں پر سے پردہ اٹھاتی ہے بلکہ قوموں کا مستقبل کی راہوں کو بھی ہموار کرتی ہے -

چونکہ تاریخ انسان کے ذہن کی تعمیر میں مدد دیتی ہے - اس لئے تاریخ کا علم خطرناک بھی ہوتا ہے اور مفید بھی -- اس علم کے سہارے قوم پرستی - مذہبی جنونیت 'فاشزم ' امپیریل ازم ' توسیع پسندی ' نسل پرستی ' اور ہیرو پرستی کے تحت قوموں میں نفرتیں پیدا کی جاتی ہیں ' جنگ و جدل کے جذبات کو فروغ دیا جاتا ہے ' تو دوسری طرف تاریخ ہی کے ذریعے انسان دوستی ' لبرل ازم ' جمہوریت اور انسانی حقوق کی جنگ بھی لڑی جاتی ہے -

حکمران طبقے تاریخ کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ اپنی عزت ' وقار اور احترام کے جذبات پیدا کر کے تاریخ میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں ' مگر دوسری طرف ایسے ادارے اور طبقے بھی ہوتے ہیں کہ جو تاریخ کے دشمن ہوتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کو کس طرح سے چھپایا جائے یا اسے مٹایا جائے ' کیونکہ ان اداروں اور طبقوں کا ماضی گھناؤنا ہوتا ہے اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ تاریخ ان کے ماضی کو سامنے لائے اور اس ذریعہ سے ان کی بدعنوانیوں کو ظاہر کیا جائے ' وہ صرف

تاریخ کو اپنی عظمت کے لئے تو استعمال کرنا چاہتے ہیں مگر اس سے خوف زدہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ ان کی اصل شکل لوگوں کو نہ دکھادے۔

اس لئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ تاریخ کا ایک محدود نقطہ نظر لوگوں کے سامنے رکھا جائے' اس لئے انقلابات اور بحرانوں کے وقت وہ تاریخ کو اپنے نقطہ نظر سے پیش کرتے ہیں' جب انقلاب کا خطرہ ہوتا ہے تو وہ لوگوں کو اس کے نتائج سے ڈراتے ہیں' اور انقلاب کو روکنے کی تدابیر بھی پیش کرتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف ترقی پسند قوتیں بھی تاریخ سے سہارا لیتی ہیں اور تاریخ میں عوامی جدوجہد کو اس طرح سے پیش کرتی ہیں کہ لوگوں کو حوصلہ ملے اور مایوس ہونے کی بجائے ان میں امید و عزم کے جذبات پیدا ہوں۔

مشہور جرمن فلسفی نطشے کا تاریخ کا بارے میں منفی رویہ تھا۔ اس کا کہنا تھا ہم ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس لئے ہمیں کچھ بھولنا بھی چاہئے اس کے جواب میں ایک اور مورخ نے کہا کہ ہمیں بہت کچھ یاد رکھنا چاہئے اور تاریخ کو اس طرح سے لکھنا چاہئے کہ جو زندگی کی تازگی دے اسے حبس زدہ نہ کر دے۔

اس لئے تاریخ لکھنے کے لئے تربیت یافتہ مورخوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ تربیت یافتہ مورخ ہی واقعات کی اہمیت اور ان کی روح کو سمجھ سکتا ہے' ایک غیر تربیت یافتہ مورخ کی نظروں میں بہت سے واقعات غیر اہم ہوتے ہیں اور وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ ان کا ادراک کر سکے۔ کیونکہ صرف تربیت یافتہ مورخ کی نگاہ اس قابل ہوتی ہے کہ وہ واقعات کی نوعیت اور حقائق کے اثرات کو دیکھ سکے اور ان کا تجزیہ کر سکے' ہٹو فیلڈ نے اس کے مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ ایک عام آدمی کے لئے کوئی مشین ایک سربستہ راز ہوتی ہے۔ مگر اپنی مشین ایک مستری کے لئے کھلی کتاب کی مانند ہوتی ہے کہ جس کے ہر پرزے سے اس کی واقفیت ہوتی ہے۔ مورخ کی مثال بھی ایسی ہی ہے اگر وہ تربیت یافتہ ہوتا ہے تو وہ واقعات کی کھوج ایک ماہر کی حیثیت سے لگاتا ہے اور ان سے جھوٹ اور سچ کو علیحدہ کرتا ہے غیر تربیت یافتہ مورخ اس قابل نہیں ہوتا کہ واقعات کے جنگل کو صاف کر

کہ انھیں ترتیب دیا جائے گا اس لئے تاریخ کے علم کو جب تک ترتیب کے ساتھ نہ لکھا جائے گا اور جب تک اس کی تشکیل ماہرین کے ہاتھوں نہ ہو گی - تاریخ ایک مستحکم علم کی شکل اختیار نہیں کرے گی -

یونیورسل تاریخ

ابتداء میں ہر قوم صرف اپنی تاریخ میں دلچسپی لیتی تھی اور اسے محفوظ کرنے کی کوشش کرتی تھی 'لیکن جب تجارت 'سیاست 'ہجرت 'جنگ و جدل' اور سفارتی تعلقات نے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب کیا تو ان میں ایک دوسرے کو جاننے کا شوق بھی پیدا ہوا - اگرچہ ہر قوم کی تاریخ جدا ہوتی ہے لیکن اس انفرادیت کے باوجود قوموں میں کئی عناصر ایسے ہوتے ہیں جو ان کو آپس میں ہم آہنگ کرتے ہیں - اسی لئے ٹائن بی نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک مورخ تمام انسانی تہذیبوں کا مطالعہ نہیں کرے گا اور ان تہذیبوں کا آپس میں مقابلہ نہیں کرے گا - اس وقت تک اس کے لئے ناممکن ہو گا کہ وہ تاریخ میں کوئی منصوبہ تلاش کر سکے یا تاریخی عمل کو کوئی مفہوم دے سکے 'اور نہ اس کے لئے یہ ممکن ہو گا کہ وہ کوئی فیصلہ صادر کر سکے -

جب ہر قوم علیحدہ سے اپنی تاریخ لکھتی ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے کارناموں کو بیان کرے 'اور تاریخ میں اپنی اہمیت کو اجاگر کرے دوسری قوموں کی تاریخ کے مطالعہ کے ان میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنی عظمت کو قائم کرے اور اس طرح دوسروں کی خوبیوں اور کارناموں کو یا تو کم کرے 'یا ان کو نظرانداز کر دے - اس نقطہ نظر سے تاریخ تنگ ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی وسعت کو گھٹا دیا جاتا ہے - تاریخ کو اس تنگنائے سے نکالنے میں آثار قدیمہ کی دریافتوں کو بڑا دخل ہے 'ان دریافتوں نے دنیا کی قدیم تہذیبوں کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے - جس سے قدیم تہذیبوں کی نہ صرف عظمت قائم ہوئی - بلکہ اس عہد کے انسان کی ذہنی پختگی کا بھی احساس ہوا - ان آثار قدیمہ کی دریافتوں نے انسانی ذہن میں اس تجسس کو پیدا کیا کہ وہ تہذیب و تمدن کے ارتقا کو سمجھے اور اس عمل کے پس منظر میں جو قوانین ہیں انہیں دریافت کرے - اس لئے اس نے تہذیبوں کو انفرادی طور پر دیکھنے کے بجائے - اسے بحیثیت مجموعی انسانی تہذیبی ترقی کے طور پر دیکھا اور اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا کر

اگر انسانی تاریخ کو کلی سمجھنا ہے تو پھر یونیورسل تاریخ لکھی جائے۔

کیونکہ یونیورسل تاریخ میں تمام قوموں کی سرگرمیاں، کارنامے اور ان کے اعمال ہوں گے۔ اس مجموعی ترقی سے انسانی تاریخ اور انسانی تہذیب و تمدن کا تجزیہ کیا جا سکے گا۔ اور اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو گا کہ تاریخ کے عمل کو سمجھا جا سکے۔ اگر قومیں انفرادی طور پر اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں، تو ایسی تاریخیں۔ تاریخ تاریخ کے عمل اور یک جہتی کو توڑ دیں گی اور تاریخ کو بحیثیت مجموعی نہیں سمجھا جا سکے گا۔

یونیورسل تاریخ کے نظریہ کو عیسائیت اور اسلام کے مذہبی عقائد نے بھی تقویت دی۔ کیونکہ یہ دونوں مذہب آفاقی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کی نظر میں تمام قومیں یکساں اور مساوی طور پر خدا کی مخلوق ہیں، اور یہ سب مل کر خدا کے منصوبہ کی تکمیل کر رہی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے تحت ہر قوم کی جداگانہ طور اہمیت ہے۔

اگرچہ یونیورسل تاریخ کا بنیادی مقصد تو یہی تھا۔ اس کے ذریعہ انسانی کارناموں اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو بیان کیا جائے۔ مگر ہوا یہ کہ جن مورخوں نے یہ تاریخ لکھی انھوں نے اس کے ذریعہ اپنے قومی نقطۂ نظر کو آگے بڑھایا۔ عربوں نے یونیورسل تاریخ لکھتے وقت انسانی تہذیب و تمدن میں عربوں کے کردار کو اجاگر کیا اور یہ ثابت کیا کہ عربوں سے پہلے جاہلیت کا دور تھا، انھوں نے بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کو اس لئے فتح کیا کہ وہ بدعنوانیوں اور خرابیوں کی وجہ سے فرسودہ اور کہنہ ہو گئیں تھیں۔ عربوں نے فتوحات کے ذریعہ خراب نظام کو ختم کر کے ایک ایسا نظام قائم کیا کہ جس میں انسانیت کی بھلائی تھی، اپنے اس نقطۂ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انھوں نے ان قوموں اور ملکوں کی تاریخیں لکھیں کہ جنھیں انھوں نے فتح کیا تھا، اور خصوصیت سے ان پہلوؤں کو ابھارا کہ جن سے ان کی خرابی ظاہر ہوتی تھی۔

جب اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں یونیورسل تاریخ لکھنے کا رواج ہوا، تو مورخوں نے اس کے پس منظر میں اپنی قوموں کے کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور یونیورسل تاریخ کو قومی جذبہ کے تحت لکھ کر اس کا دائرہ محدود کر دیا۔ مثلاً جرمنی کے مشہور

مورخ رانکے نے جو یونیورسل تاریخ لکھی اس میں اس نے جرمن ٹیوٹونک اور رومیوں کو اس تاریخ کا مرکز بنایا اور دوسری قوموں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی' یہاں تک کہ یونانیوں کو بھی زیادہ نہیں ابھارا۔

اس قسم کی تاریخ نویسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی مورخوں نے یونیورسل تاریخ کے پس منظر میں اپنی قوموں کے کارناموں کو اس طرح سے بیان کیا کہ جیسے ان کی قوم کے کارنامے محض ایک قوم کے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے تھے' فرانسیسی مورخ مشلے نے یونیورسل تاریخ میں فرانسیسی قوم کی سرگرمیوں اور تاریخ کو اس طرح سے بیان کیا کہ جیسے یہ پوری دنیا اور اقوام کی تاریخ ہو اس کا کہنا تھا کہ فرانس کے ذریعہ اقوام عالم کی امیدوں اور خواہشات کا اظہار ہوتا ہے فرانس نے انقلاب کے وقت جو قربانیاں دیں اس کے نتیجہ میں پوری دنیا میں نہ صرف انقلابات آئے بلکہ ان میں ذہنی و فکری تبدیلیاں بھی آئیں اس لئے تمام اقوام کو فرانس کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ اس کی وجہ سے انقلاب انگیز عمل تیز تر ہوا۔

ایک دوسرے فرانسیسی مورخ گزو نے اس بات پر زور دیا کہ یونیورسل تاریخ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذریعہ خدا اپنے منصوبے کو پورا کر رہا ہے' اور اس منصوبہ کی تکمیل فرانسیسی تہذیب میں ہے۔ ہیگل نے اس نقطۂ نظر کو ذرا وسیع کر کے پیش کیا کہ خدا تاریخ کے ہر عہد میں کسی ایک قوم سے اپنے منصوبہ کی تکمیل کے سلسلہ میں کوئی کام لیتا ہے۔ اور جب وہ قوم خدا کے منصوبہ کو پورا کر لیتی ہے تو وہ خستہ ہو کر ختم ہو جاتی ہے' اس لئے اس منصوبہ کے کرداروں میں سبھی اقوام آتی ہیں۔

یونیورسل تاریخ کو لکھتے وقت محض واقعات کو بیان نہیں کرنا چاہئے' بلکہ اس عمل کے پس منظر میں جو دلیل اور عقل کام کر رہی ہے اس کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ یونیورسل تاریخ میں واقعات سے زیادہ دلیل و عقل کے ارتقاء کی اہمیت ہے۔ جب یونیورسل تاریخ کو اس انداز سے لکھا جائے گا تو اس سے امید کے پہلو نکلیں گے۔ کیونکہ اسی نقطۂ نظر سے انسانی ترقی کا احساس ہو گا۔

[illegible] دور میں یونیورسل تاریخ کے لکھنے میں بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں - اب اس کو ریاست اور قوم کے بجائے تہذیب و تمدن کے پس منظر میں لکھا جانے لگا ہے - اس میں خصوصیت سے اشپنگلر اور اور ٹائن بی قابل ذکر ہیں کہ جنھوں نے دنیا کی منتخب تہذیبوں کے مطالعہ کے بعد ان کے ارتقاء اور تکمیل کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی اور یونیورسل تاریخ کو واقعات کے بجائے قوانین کی روشنی میں لکھا -

نو آبادیاتی دور میں یورپی مورخوں نے یونیورسل تاریخ لکھتے وقت یورپ کو مرکز بنایا تھا اور ایشیا و افریقہ کی تہذیبوں کو نظر انداز کر دیا تھا مگر اب کئی دریافتوں کے ساتھ ساتھ یونیورسل تاریخ کے تصورات میں بھی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور اب چین ہندوستان اور قدیم امریکی تہذیبوں کی اہمیت کے بارے میں بھی لکھا جا رہا ہے اس سے یونیورسل تاریخ کو نئے معنی اور مفہوم ملے ہیں -

یونیورسل تاریخ کو وسیع نقطہ نظر سے لکھنے اور مطالعہ کے نتیجہ میں قوموں میں جو تلخیاں، نفرتیں - اور عداوتیں ہیں وہ دور ہو سکیں گی اور ان میں یہ احساس ہو گا کہ دنیا میں کارنامے خاص خاص قوموں کے نہیں ہوتے بلکہ بحیثیت مجموعی انسانوں کے ہوتے ہیں -

سیکولرازم کیا ہے؟

سیکولرازم کا مطلب ہے کہ وہ سماجی عمل کہ جس کی وجہ سے مذہبی اثر و رسوخ جو معاشرے پر ہوتا ہے اس سے اسے آزاد کیا جائے اور مذہب کو انسان کی زندگی میں نجی حیثیت دی جائے۔ سیکولرازم اور مذہب اس وجہ سے دو متضاد نظریئے بنتے ہیں کیونکہ مذہب اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا انسان کے جسم اور روح دونوں پر تسلط ہے اور اس لئے صرف اس کے ذریعہ انسان کی مادی اور روحانی نجات ممکن ہے' اس کی وجہ سے انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک مذہبی رسومات اور روایات کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے اور اسے اس بات کی آزادی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے سماج کے معاملات کو عقل اور زمانے کے تقاضوں کی بنیاد پر حل کر سکے۔ مذہب اپنی بقاء کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ ہر اس کوشش کو ناکام بنائے کہ جس کے ذریعہ اس کا تسلط خطرے میں پڑتا ہو۔ اس وجہ سے مذہب سب سے زیادہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ نظام تعلیم کو مکمل اپنے قبضہ میں رکھا جائے اور تعلیم کا ایک ایسا نظام ترتیب دیا جائے کہ جس کے ذریعہ مذہبی عقائد نوجوان نسل کے ذہنوں میں راسخ ہو جائیں۔

جب میں معاشرہ میں مذہبی عقائد و اقدار مستحکم ہوتی ہیں تو ان کا بنیادی اثر یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی تمام سرگرمیاں اور تخلیقی صلاحیتیں ان حدود میں رہتے ہوئے کام کرتی ہیں کہ کس طرح سے مذہبی اقدار کو استحکام ملے۔ فلسفہ اپنے افکار و نظریات کے ذریعہ ان کی صداقت کو ثابت کرے۔ سائنس صرف اس حد تک تجربات کرے کہ جہاں تک مذہبی عقائد اس کی اجازت دیں۔ آرٹ' موسیقی' اور فن تعمیر صرف مذہبی مقاصد کے لئے کام کریں' اس طرح ان تمام علوم و آرٹ و فن کا تعلق معاشرہ سے کٹ جاتا ہے۔ ان کا معاشرہ کی فلاح و بہبود سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے' اور نہ یہ انسانی کی ضرورت و تسکین کے لئے ہوتے ہیں۔ مشہور مفکر سوروئے کن نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ دور عقیدہ میں' یا وہ زمانہ کہ جس میں مذہب کا تسلط ہوتا ہے اس زمانہ

میں جو بھی ادب تخلیق ہوتا ہے اس کے موضوعات مذہبی ہوتے ہیں جیسے مہا بھارت ’گیتا‘ یا

یورپ میں قرون وسطیٰ میں ڈوائن کامیڈی وغیرہ ‘ ہمارے معاشرے میں آج تک نعت ‘ مرثیہ ‘ اور قصیدہ میں مذہبی جذبات کو منظوم کیا جاتا ہے - اس طرح اس دور میں موسیقی دیوی دیوتاؤ کو خوش کرنے یا مذہبی خوشی و عقیدت کے اظہار کے لئے استعمال ہوتی ہے ‘ ہمارے ہاں قوالی ‘ اور نعتوں کو گا کر پیش کرنا ‘ یا مزاروں پر جو موسیقی پیش کی جاتی ہے وہ اس کی مثال ہے ‘ اس دور میں جو عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں ان میں شہر کی سب سے اونچی عمارت میں یورپ میں کیتھڈرل یا چرچ کی ہوا کرتی تھی ‘ اور سیکولر مقاصد کی عمارتیں اتنی شاندار نہیں ہوا کرتی تھیں ‘ اسلام آباد میں فیصل مسجد ہمارے ہاں اس کی مثال ہے -

تاریخ میں معاشرہ کو سیکولر بنانے کا جو عمل یورپ میں ہوا - اس سے اس عمل کے تجزیہ کا موقع ملتا ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے کہ جنھوں نے یورپ کے معاشرہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مذہبی عقائد کے تسلط کو ختم کرکے اس کی جگہ فرد کی آزادی اور معاشرہ کے مفادات کو دے اور ایک ایسا نظام قائم کرے کہ جس میں مادی ترقی کی راہیں کھلی ہوں - سیکولر ازم کا مطلب صرف سیاسی نظام سے مذہبی تسلط کا خاتمہ نہیں بلکہ اس سے زندگی کے ہر پہلو کو آزاد کرانا ہے تاکہ وہ آزادی سے اپنے مفادات ضروریات اور تقاضوں کے تحت روایات - واقدار - اور قانون بنا سکے -

یورپ کے معاشرہ میں اس وقت تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں کہ جب شہروں میں بورژوا طبقہ پیدا ہوا اور اس نے تجارت کے ذریعہ دولت کمانا شروع کی اور اس دولت کی مدد سے آہستہ آہستہ شہروں میں سیاسی مراعات اور اقتدار حاصل کرنا شروع کر دیا - اس عمل سے نظام جاگیرداری پر کاری ضرب لگی - اب تک جو کاشت کار گاؤں اور دیہات میں ان کے زیر اثر تھے وہ ان کے چنگل سے نکل کر بہتر مواقع اور روزگار کی تلاش میں شہروں میں آنے لگے اور یہاں پر فیکٹریوں میں کام کرنے لگے - اس تبدیلی نے ان لوگوں کی زندگی پر زبردست اثر ڈالا - کیونکہ شہروں میں آباد ہونے کے بعد ایک تو وہ فطرت سے کٹ گئے دوسرے ان کی معروفیات بڑھ گئیں اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں رہا کہ وہ مذہبی رسومات و

عبادات ادا کر سکیں - اگر چہ وہ پوری طرح سے مذہب سے آزاد نہیں ہوئے اور پیدائش' شادی اور موت پر چرچ کی رسومات ادا کرتے رہے مگر اس سے مزہب کا غلبہ ضرور کم ہوا -

تحریک اصلاح مذہب نے پوپ کی روحانی اجارہ داری کو توڑا اور چرچ کے اثر و رسوخ میں کمی آئی - چونکہ مذہبی جنگوں کے بعد یہ اصول طے ہوا کہ جو مذہب بادشاہ کا ہو گا وہی اس کی رعیت کا ہو گا - اس سے بادشاہ کو نہ صرف مذہبی طاقت ملی بلکہ سیاسی طور پر بھی وہ مکمل طور پر خود مختار ہو گیا اور اس نے اپنے مفادات کے تحت مذہبی اثر و رسوخ سے آزاد ہونے کے لئے سیکولر نظریات کو فروغ دیا کیونکہ سیکولرازم کے ذریعہ وہ پوپ اور چرچ سے خود کو آزاد کر سکتے تھے -

تحریک اصلاح مذہب کی وجہ سے لاطینی زبان کا زوال ہوا' اور اس کی جگہ مقامی زبانوں نے لینا شروع کر دی - مقامی زبانوں کی ترقی اور فروغ میں سیاستدانوں - وکیلوں' شاعروں' ادیبوں اور مفکرین نے حصہ لیا - اس کی وجہ سے مقامی ثقافت اور اس کے رسوم و رواج جو اب تک مذہبی اثرات کے تحت دبے ہوئے تھے انہیں ابھرنے کا موقع ملا - عیسائیت کی وجہ سے اب تک عالمی ریاست اور عالمی چرچ کا نظریہ مقبول تھا کہ جس میں قومی ریاست اور قومی تشخص کی کوئی گنجائش نہیں تھی - جب یہ نظریات ٹوٹے تو یورپ کی قوموں میں اس کی جستجو ہوئی کہ وہ اپنی جڑیں تلاش کریں اور ان کی بنیاد پر اپنی قوم کی تشکیل کریں - چنانچہ اس نئے جذبہ نے ان میں تاریخ - آثار قدیمہ لوک کہانیوں اور گیتوں کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ کیا - یورپ میں اس عمل کے نتیجہ میں ایک طرف تو یونان و روم کی تہذیبوں میں اپنی جڑیں ڈھونڈیں تو دوسری طرف عیسائیت سے پہلے کی تاریخ پر تحقیق کر کے اپنی تاریخ کو مکمل کرنا شروع کیا - جرمن میں گرم برادرز نے قدیم جرمن لوک کہانیوں کو تلاش کر کے جمع کیا تو مورخوں' ماہر آثار قدیمہ اور ماہر علم بشریات نے قدیم جرمن قبائل کی تاریخ کی نئی تشکیل دی جس کے زیر اثر جرمن قوم کی ساخت و ہیئت بدل گئی اور ان میں ایسا قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہوا کہ جس نے ان کی تہذیب کو ایک نئی توانائی دی -

ذرائع نقل و حمل کی بہتری' چھاپہ خانہ کی ایجاد' نئے راستوں کی دریافت اور سیرو

سیاحت کی وجہ سے دنیا کے بارے میں واقفیت بڑھی اور اہل یورپ کو دوسری تہذیبوں سے

آگاہی ہوئی' اس سے انھیں اندازہ ہوا کہ سچائی پر ان ہی کی اجارہ داری نہیں بلکہ دوسرے تمدنوں میں لوگ ان سے بہتر اور اچھی زندگی گزار رہے ہیں اس نے ان میں وسیع النظری اور قوت برداشت پیدا ہوئی۔

جب ایک مرتبہ یورپ قومی میں ریاستیں قائم ہوگئیں تو ان میں سے ہر ایک کو اپنی ریاست کو مضبوط و مستحکم کرنے کو جذبہ پیدا ہوا۔ باہمی رقابت و مقابلہ نے انھیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کو بہتر بنائیں۔ اس کے نتیجہ میں سائنسی، فنی اور سماجی علوم کی ترقی کی طرف توجہ دی گئی اور اہل علم کو پہلی مرتبہ اس کی آزادی ملی کہ وہ اپنی تخلیقات کھلے ماحول میں کر سکیں۔ چنانچہ سائنس کے ساتھ ساتھ ادب' موسیقی' تعمیرات اور آرٹ میں انقلاب آفریں تبدیلیاں آئیں' اور انھوں نے اپنا موضوع اب انسان اور معاشرہ کو بنایا اور اس کی ترقی و فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا شروع کیا۔

مثلاً اس نظریہ سے کہ انسان فطری طور پر نیک ہے اس کے ذہن کو سیکولر بنانے میں حصہ لیا' کیونکہ اس اصول کے تحت انسان مذہبی جنونیت' مطلق العنانیت اور رجعت پسندی کے خلاف لڑا' کیونکہ جب انسان فطرتاً نیک ہے تو پھر مذہبی عقائد کی کیا ضرورت ہے کہ اسے نیک بنائیں۔ مطلق العنانیت کی کیا ضرورت ہے کہ سے اپنے قابو میں لائے اور اپنے راستہ پر چلائے۔ اس کے برعکس اس کو اس کی آزادی ہونی چاہئے کہ وہ بغیر پابندیوں کے آزادی سے پھلے پھولے۔'

اس فکر نے لوگوں میں لبرل ازم کو پیدا کیا۔ قدامت پرست معاشرے میں جو لوگ ان کی روایات سے انحراف کرتے ہیں انھیں آزاد خیال کہا جاتا ہے جو کہ اکثر منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ وہ اخلاق اور قانون کی حدود سے باہر چلا گیا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج بھی آزاد خیال کا تصور انھیں معنوں میں ہے' اور یہ طنزاً ان لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو کہ رجعت پرست روایات کے خلاف ہوتے ہیں۔۔

آزاد خیال اور لبرل لوگوں نے یورپ میں نہ صرف اخلاقی و قانونی اور سماجی روایات سے انحراف کیا بلکہ انھوں نے انسانی ضمیر کی آزادی' اور اس بات کی آزادی کہ انسان اپنے عقائد کے لئے دوسروں کے سامنے جواب دہ نہیں' زور دیا' اور اس بات پر زور دیا کہ ریاست کا یہ کوئی حق نہیں کہ فرد کے مذہب کے بارے میں اس کا احتساب کرے- جب ایک فرد کو یہ حق مل جاتا ہے تو اس کے بعد سے ریاست اور معاشرہ کی ایسی تمام روایات' رسوم و رواج ختم ہو جاتی ہیں جو کہ فرد کو اس کی مرضی کے خلاف مذہبی بنانے پر مجبور کرتی ہیں- اس طرح سے آزاد خیال نظریات نے سیکولرازم کو استحکام بخشا-

معاشرہ کو سیکولر بنانے اور مذہبی اثرات کو ختم کرنے کے لئے جس عمل کی ضرورت ہے اس کی نشان دہی کرتے ہوئے مارکس کہتا ہے کہ مذاہب انسان کی تخلیق ہیں' اس نے انھیں اس لئے پیدا کیا کہ ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا- کیونکہ وہ انتشار زدہ اور بکھرے ہوئے پر خوف ماحول میں رہتا تھا- اس طرح سے مذہب سماجی بیماریوں کی علامت ہے' یہ بیمار کو حوصلہ دیتا ہے کہ وہ اسے برداشت کرے- یہ مرض کو قابل برداشت بناتا ہے اور اس کے لئے علاج دریافت نہیں کرتا- نہ ہی اس سے مریض میں صحت مند ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے- اس لئے مذہب استحصال شدہ لوگوں کی ایک دکھ بھری آہ ہے' یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کا دھڑکتا ہوا دل ہے- یہ بے روح لوگوں کے لئے جاندار روح ہے اس طرح سے یہ لوگوں کی افیون ہے کہ جو انھیں سکون و راحت دیتی ہے- اس لئے اگر انسان کے خیالات بدلنا ہوں تو توہمات کو توڑنا ہوگا- محض مذہب کے خلاف تبلیغ سے یا عقائد کو فلسفیانہ طریقہ سے کمزور کرنے سے کچھ نہیں ہوتا- اس کے لئے لوگوں کی زندگی اور ماحول کو بدلنا ہوگا- مذہب کو ختم کرنے کے لئے سائنس کی نہیں سماجی انقلاب کی ضرورت ہے-

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے جو نظام قائم کیا وہ مذہبی اور سیکولر دونوں قسم کا تھا- مسلمان حکمران ایک طرف تو شریعت کے نفاذ کا اعلان کرتے تھے مگر جہاں ان کے مفادات شریعت سے ٹکراتے تھے وہاں وہ ان سے روگردانی کرکے اپنے قوانین بناتے اور ان پر

عمل کرتے تھے - اس لئے شریعت کے ساتھ ساتھ آئین جہانداری [illegible] تھے مگر جہاں تک ہو سکتا تھا یہ اپنے ان قوانین کو بھی مذہبی بنانے کے لئے علماء سے فتویٰ لیتے رہتے تھے - ان حکمرانوں میں صرف علاؤ الدین خلجی ایسا تھا کہ جس نے قاضی مغیث کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے معلوم نہیں کہ اس کی اصلاحات و اقدام شریعت کے مطابق ہیں انہیں مگر وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ عوام کی فلاح کن باتوں سے ہوتی ہے -

لیکن اس پورے دور میں نظام تعلیم پر علماء کا تسلط تھا' اور نصاب تعلیم پورا کا پورا مذہبی بنیادوں پر تھا - علماء نے ایسے تمام علوم کی مخالفت کی کہ جو مذہبی عقائد اور تعلیمات سے تضاد رکھتے تھے - اصول یہ تھا کہ ہر وہ علم بیکار ہے کہ جو مذہب کی ترقی میں حصہ نہ لے - فلسفہ کی اس لئے شدت سے مخالفت کی گئی کہ یہ شک اور دلیل کے جذبہ کو پیدا کرتا ہے جو اعتقادات کے لئے انتہائی خطرناک ہوتا ہے - اسی طرح ادب و شاعری' موسیقی' مصوری' اور مجسمہ سازی کی مخالفت کی گئی - اور سائنس تو پورے عہد میں ابھر ہی نہیں سکی -

ہندوستان میں انگریزوں کے آنے کے بعد مسلمانوں نے مغربی علوم کی اس لئے مخالفت کی کہ انہیں اپنے عقائد کے کمزور ہونے کا خطرہ تھا - اس کے نتیجہ میں وہ نہ صرف تعلیمی میدان میں پیچھے رہے بلکہ سیاست و معیشت میں بھی ترقی نہ کر سکے -

اسی وجہ سے برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان و پاکستان میں یہ دو رجحانات واضح نظر آتے ہیں - ہندوستان کا نظام سیاست سیکولر بنیادوں پر بنایا گیا جس کی وجہ سے معاشرہ کی تخلیقی صلاحیتیں تمام مذہبی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی پوری توانائی کے ساتھ ابھریں - ایک سیکولر ریاست کی حیثیت سے ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ فرقہ واریت' بنیاد پرستی' اور مذہبی جنونیت کو روکنا اور ختم کرنا ہے' اور اس وجہ سے ان کے دانشور و مفکران مسائل کے پس منظر میں جو معاشی و سماجی و مذہبی وجوہات ہیں ان کا تجزیہ کر رہے ہیں -

ایک سیکولر ریاست کی حیثیت سے انھوں نے تعلیم کو مذہب سے آزاد کر دیا ہے' جس کی وجہ سے اب سائنسی و سماجی علوم مذہب کو صحیح ثابت کرنے کے بجائے انسان اور معاشرے کے مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے میں مصروف ہیں - اس لئے آبادی کا

اضافہ ' ماحولیات کو بہتر بنانا ' غربت کا خاتمہ اور توھم پرستی کو روکنا ' ان کے اہم مسائل ہیں۔ ہندوستان کے معاشرے کو مکمل طور پر سیکولر بننے میں شاید طویل عرصہ لگے مگر اس عمل کی ابتداء ان کے ہاں ہو چکی ہے اور اس کے نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں پاکستان میں معاشرہ کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو مذہبی عقائد و رسومات اور روایات نے اپنے آہنی پنجہ میں جکڑ رکھا ہے۔ ادب و شاعری ' مصوری ' موسیقی ' اور مجسمہ سازی پر فحاشی و عریانی اور مخذب اخلاق ہونے کے فتوئی لگتے رہتے ہیں۔ اس لئے ادیب کا قلم ' مصور کا برش ' اور مجسمہ ساز کا ہتھوڑا ' اور موسیقار کی انگلیاں اس سنسر شپ کے باعث بار بار رکتی اور سوچتی ہیں۔ ان کے ہاں وہ بہاؤ اور جوش نہیں ہوتا کہ جس کی فن کار کو ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں ان پابندیوں میں مرجھا کر رہ جاتی ہیں۔

اس عرصہ میں سب سے زیادہ نقصان نظام تعلیم کو پہونچا ہے۔ کیونکہ پورا نظام مذہبی بنیادوں پر استوار ہے۔ اسلئے طالب علم نہ تو ادب کی باریکیاں سمجھ سکتا ہے اور سائنس کے تجربات اسے اس دنیا اور کائنات کے بارے میں اندھیرے میں رکھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ شخص نہ تو تبدیل ہوتی ہوئی دنیا کو سمجھ سکتا ہے اور نہ موجودہ دور کے چیلنجوں کا جواب دے سکتا ہے وہ مذہب کے حصار میں قید ہو کر خود کو ہر خطرے اور بلا سے محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ نظام تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات کو پورا کرے ' اور ان مسائل کو حل کرے جو کہ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

چونکہ پاکستان میں سنی فرقہ کی اکثریت ہے اس لئے یہاں کا مذہبی نظام سنی عقائد پر ہے اور یہ تشدد کے ساتھ اپنے عقائد کو معاشرہ میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے دوسرے مذہبی فرقے خود کو اپنے عقائد میں آزاد اور خود مختار نہیں پاتے۔ اور رد عمل کے طور پر وہ اپنے عقائد کے تحت ریاست کے قوانین کو بدلنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ کوئی مذہبی اس پر تیار نہیں کہ کسی دوسرے فرقے کی بالادستی کو قائم کرنے دے اس وجہ سے شیعہ بریلوی ' اہل

حدیث ' اور دیوبندی وہ اہم فرقے ہیں کہ جو اپنے مذہبی اعتقادات کی بالادستی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں - اس مقصد کے لئے ان کی سیاسی تنظیمیں ہیں جو کہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے اپنے عقائد کا نفاذ چاہتی ہیں - اس نے پورے معاشرے کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر کے مذہبی تنگ نظری اور فرقہ وارانہ تعصب کو پیدا کر دیا ہے -

ایک لحاظ سے مذہب کو سب سے زیادہ آزادی سیکولر نظام میں ہوتی ہے کیونکہ سیکولر ریاست میں کسی ایک مذہب کی اجارہ داری نہیں ہوتی - اور نہ ریاست کسی ایک مذہبی فرقہ کی سرپرستی کرتی ہے اس لئے تمام مذاہب اور فرقے بالکل آزاد ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اعتقادات کی ترقی میں حصہ لیں ' اور دلیل و عقل کی بنیاد پر اگر چاہیں تو دوسرے لوگوں کو بھی متاثر کریں - اس وجہ سے ایک مغربی مورخ کنتھ ول اسمتھ کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو سیکولر ریاست میں رہتے ہوئے اسلام پر زیادہ آزادی اور کھلے ماحول میں تحقیق کے مواقع ہیں - جو کہ پاکستان میں نہیں - اس وجہ سے ہندوستان میں اس کے مواقع ہیں کہ وہاں اسلام ایک توانائی کے ساتھ ابھر سکتا ہے -

سیکولر ریاست کی حیثیت مذہبی معاملات میں بالکل غیر جانبدار کی ہوتی ہے - اس میں مذاہب ریاست کی طاقت میں دخل اندازی کے بغیر اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتے ہیں - مگر انھیں اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ ریاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں اور سیاسی اقتدار حاصل کر کے صرف اپنی اجارہ داری قائم کریں -

سیکولر معاشرہ میں چونکہ اظہار رائے کی آزادی ہوتی ہے - اس میں قوت برداشت کا اصول ہوتا ہے اس لئے اس میں مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ غیر مذہبی اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کریں - سنسر شپ کو یہ حق نہیں کہ کتابیں جلائیں یا ان پر پابندیاں لگائیں --

سیکولر نظام کی سب سے اہم بنیاد یہ ہے کہ اس میں عوام کی بالادستی قائم ہوتی ہے ' اور عوام کے نمائندے معاشرہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کے تحت قوانین بناتے ہیں - اس میں قانون کے ابدی اور آفاقی ہونے کا تصور نہیں ' بلکہ یہ قانون معاشرہ کی اپنی جڑوں سے

ابھرتا ہے جو ان کے تقاضوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور جب یہ تقاضے پورے ہو جاتے ہیں تو پھر ایک نیا قانون کا نظام وجود میں آجاتا ہے۔ اس طرح سیکولر نظام اور جمہوریت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن جاتے ہیں۔

قوم پرستی کیا ہے!

جب انسان نے اجتماعی زندگی گذارنی شروع کی تو وہ قوم، نسل، قبیلہ، اور برادری میں تقسیم ہو گیا تاکہ وہ مل جل کر مشترکہ طور پر رہ سکے اور اپنا تحفظ قائم رکھ سکے - ان جماعتوں اور گروہوں میں اتفاق و یک جہتی کے لئے عصبیت کا جذبہ پیدا ہوا کہ جس نے انھیں آپس میں ملائے رکھا - اس عصبیت نے قبائل - اور قوموں میں برتری اور افضلیت کے جذبات پیدا کئے - ان جذبات سے خصوصیت کے ساتھ فاتح اقوام نے فائدہ اٹھایا - اور مفتوح قوموں کو خود سے کم تر قرار دے کر ان پر حکومت کی اور ان کا استحصال کیا - عرب و عجم، سفید و سیاہ فام اقوام کے تصورات انھیں نظریات کی وجہ سے پیدا ہوئے - شاید انھیں مفتوح اور کمزور قوموں نے "نسل انسانی" اور "مساوات" کے نظریوں کی تبلیغ کی کہ جس میں تمام اقوام رنگ و نسل کے اعتبار سے ایک قرار پائیں - جن کے پاس قوت و طاقت نہیں ہوتی وہ فکر اور ذہنی طور پر تبدیلی چاہتے ہیں تاکہ ان کے مفادات کا تحفظ ہو سکے - مگر جن کے پاس طاقت ہوتی ہے وہ نسلی برتری اور قومی تفخر کی بات کرتے ہیں تاکہ اس ذریعہ سے وہ اپنی مراعات کو باقی رکھ سکیں -

نسل انسانی کا تصور ان مذاہب نے دیا کہ جو اپنے ابتدائی دور میں مظلوم طبقوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور اس طرح سے معاشرہ میں مساوی اور باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے تھے، مگر جب وہی مذہب سیاسی طور پر طاقت ور ہو گئے تو انہوں نے مومن و کافر کے فرق کو قائم کر کے نسل انسانی کے تصور کو رد کر دیا - اور توسیع سلطنت کی خاطر قوموں کا استحصال کر کے انہیں سیاسی و معاشی طور پر اپنا زیر نگیں بنا لیا -

اٹھارویں صدی سے پہلے یورپ میں چرچ کا اثر و رسوخ تمام ممالک پر تھا - اس لئے یورپ تمام عیسائیوں کا روحانی سربراہ تھا - اور ہولی رومن امپائر سیاسی طور پر طاقت ور تھی - یورپ کی تمام اقوام پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے ایک عالمی برادری کا تصور ان کے مفادات میں تھا - اور آپس کی جنگوں اور قوموں میں تصادم کے باوجود یورپ ایک ثقافتی ہم

آہنگی کو برقرار رکھے ہوئے تھا- اسی طرح سیاسی طور پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں کہ جن میں کئی اقوام آباد تھیں - اس نے چرچ اور امپائر دونوں کو بین الاقوامیت کا حامی بنا دیا تھا-

اس زمانہ میں قوم کا تصور بھی محدود معنوں میں استعمال ہوتا تھا- سترھویں صدی میں فرانس اور جرمنی میں اس اصطلاح کا استعمال سیاسی لوگوں کے لئے تھا- بعد میں روسو نے اس کو رد کیا اور کہا کہ بادشاہ اور امراء قوم نہیں بلکہ عوام ایک قوم ہیں - اس کا یہ نظریہ امریکی اور فرانسیسی انقلابات میں مقبول ہوا کہ جس میں ملک کے لوگ مل کر ایک قوم بن گئے - اٹھارویں صدی میں اس نے باقاعدہ ایک نظریہ کی شکل اختیار کر لی اور بین الاقوامیت کی جگہ لے لی اور مغربی یورپ میں مقبول ہوا - انیسویں صدی کے آخر میں یہ مشرقی یورپ اور ایشیا میں پھیلا - اور بیسویں صدی میں یہ افریقہ تک جا پہونچا- قوم پرستی نے معاشرہ میں ایک انقلابی تبدیلی کی کہ اب تک لوگ شاہی خاندان اور چرچ کے وفادار ہوتے تھے - اس کے بعد سے ان کی وفاداری کا مرکز قوم ہو گئی - ایک قوم نے ریاست کی تشکیل میں مدد دی ' اور اس سے وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہوا -

یورپ میں قوم پرستی کی نشوونما میں فرانسیسی انقلاب اور نپولین کی جنگوں نے اہم حصہ لیا- کیونکہ ان جنگوں میں شکست کے بعد جرمنی وسطی و مشرقی یورپ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ انھیں اپنے وجود کے برقرار رکھنے ' اور اپنے دفاع کے لئے متحد ہونا ضروری ہے - اس کے بعد سے جرمنی اور اٹلی میں اتحاد کی تحریکیں شروع ہوئیں - جرمنی میں قوم پرستی کے جذبات کو پیدا کرنے میں دانشوروں اور مفکروں نے بڑا حصہ لیا- ہرڈر نے اس سلسلہ میں زبان اور ثقافت پر خصوصی زور دیا کہ یہ قوم کی شناخت کی اہم علامتیں ہیں - اس کے نزدیک ہر قوم کی ایک جداگانہ حیثیت ہوتی ہے اور اس کائنات کی خوبصورتی ہم آہنگی میں نہیں بلکہ فرق اور علیحدگی میں ہے - جب مختلف رنگ کے پھولوں کا گلدستہ بنتا ہے تو وہ زیادہ دلکش ' اور حسین ہوتا ہے - اس لئے فطرت نے قوموں کو پہاڑوں ' دریاؤں ' صحراؤں اور سمندروں کے ذریعہ علیحدہ کر کے اور انھیں فطری سرحدوں میں محصور کر کے ان میں خاص قومی خصوصیات کو پیدا کیا - اور ان سرحدوں میں انھوں نے

اپنی زبان، اور ثقافت کو محفوظ رکھا۔ اس دلیل کو ذہن میں رکھتے ہوئے [illegible]

[illegible] خدا نے یک قوم کی حیثیت سے پیدا کیا ہے جو پائیرنیز، الپس، اور رائن کے درمیان گھرا ہوا ہے۔

چونکہ جرمن اس تعریف میں نہیں آتا تھا۔ اس کی سرحدیں کھلی ہوئی تھیں، اس لئے فشٹے نے اس پر زور دیا کہ ایک زبان بولنے والے ایک قوم ہوتے ہیں۔ کسی بھی قوم کی تشکیل اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ دوسری اقوام سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ اس لئے ضروری ہے، کہ غیر ملکیوں سے بچا جائے تاکہ قومی ثقافت میل آلودہ نہ ہو۔ اس لئے اس نے یہ سفارش کی کہ صرف دانشوروں اور تخلیق کاروں کو باہر سفر کی اجازت ہونی چاہئے۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ جرمن قوم کو سب سے علیحدہ کر کے ان کی قومی خصوصیات کو ابھارا جائے۔

جرمنی میں قوم پرستی کے جو مختلف نظریئے پیدا ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ قومی روح زمین کے مظاہر سے پیدا ہوتی ہے۔ یہودی چونکہ صحراء کے رہنے والے تھے اس لئے وہ ذہنی طور پر بنجر رہے۔ جرمن قوم چونکہ تاریک، گھنے، اور دھند والے جنگلوں میں رہے اس لئے یہ گہرے، پراسرار، اور وسعت والے ہیں۔ ان قومی نظریات نے جرمن قوم میں فاشزم کے جذبات پیدا کرنے میں مدد دی۔

جب یورپی اقوام نے ایشیاء، افریقہ، اور امریکہ میں اپنی نو آبادیات قائم کیں اور وہاں کی اقوام کو اپنا ماتحت بنایا تو ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ یورپی اقوام کو خدا نے برتر اور افضل بنایا ہے اور ان میں خاص صلاحیتیں اور ذہانت ہے کہ جو شکست خوردہ اقوام میں نہیں۔ اس لئے ان میں نسلی طور پر برتر ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ خود یورپی قوموں میں سیاسی رقابتوں اور باہمی تجارتی لین دین نے قومی جذبات کو فروغ دیا۔ ہر یورپی قوم نے اپنی قومی روایات کو مستحکم کرنا شروع کیا تاکہ ان میں قومی اتحاد پیدا ہو اور اس سے جو توانائی قوم میں پیدا ہو اس کی بنیاد پر نو آبادیات میں اپنا اقتدار مستحکم کریں۔ اس دور میں قوم پرستی حکمراں طبقوں کے مفاد میں تھی جس کو استعمال کر کے وہ اپنے عوام کو قربانی کے لئے تیار کر

سکتے تھے اور قومی عظمت کے لئے انھیں ایشیاء و افریقہ کے ملکوں میں بھیج کر وہاں استعمال کر سکتے تھے اور ہوا بھی یہی کہ ان ملکوں کے عوام نے اس دلفریب نعرے سے مسحور ہو کر قوم کے نام پر جان دے کر امپیریل ازم کی جڑوں کو مضبوط کیا جس کا فائدہ حکمران طبقوں کو ہوا۔

فرانسیسی انقلاب کے زیر اثر یورپ میں جب قوم پرستی کے جذبات پیدا ہوئے تو اس بات کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنے معاشروں میں جمہوری اقدار کو فروغ دیں، اور عوام کو قومی تشکیل کے عمل میں شامل کر کے جمہوری حکومتیں قائم کریں۔ اس کے ساتھ قوم پرستی نے سیکولر اداروں کی تعمیر پر زور دیا اس طرح یہ قومی تحریکیں اپنے اندر جمہوری اور سیکولر روح رکھتی تھیں۔ لیکن ۱۸۴۸ء میں یورپ میں انقلاب کی جو لہر آئی اور اس میں ناکامی ہوئی۔ اس کی وجہ سے جمہوری قوتوں کو نقصان پہونچا اور اس کے ساتھ قوم پرستی کا تصور بھی بدل گیا اور ۱۸۹۰ء تک یہ ایک ایسا رجعت پسند نظریہ بن گیا کہ جس کی بنیاد پر حکمران طبقوں نے خود اپنے عوام کا استحصال کیا۔ اس کے ذریعہ تمام بین الاقوامی نظریات کی سخت مخالفت کی گئی۔ اور صدی کے آخر تک اس کا مقصد محدود اور تنگ معاشرے کا قیام ہو کر رہ گیا یہ نظریہ کیوں اور کیسے طبقوں کے لئے استعمال ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے شہروں کی آبادی بڑھنا شروع ہو گئی اور اس نے شہری و دیہاتی زندگی کے فرق کو واضح کر دیا۔ دیہات میں ثقافت محدود تھی۔ جب کہ شہروں میں اس کا پھیلاؤ زیادہ تھا۔ شہروں میں عوام اور حکمران طبقوں کے درمیان تضادات بڑھتے چلے گئے۔ کیونکہ عوام ان پڑھ اور جاہل تھے اس لئے انھیں آسانی سے گمراہ کن اور دل فریب نعروں کے ذریعہ حکمرانوں نے استعمال کیا کیونکہ اس طبقہ کے لوگ تعلیم یافتہ تھے اور قومی قیادت پر پر قابض تھے۔ اس لئے انھوں نے قوم پرستی کو نسل پرستی اور فاشزم بنا کر اپنی مفادات کے حصول کے لئے عوام کو اپنے ساتھ ملایا۔

اس صدی میں قوم پرستی میں معاشیات کا عنصر شامل ہوا۔ معاشی تحفظ اور قومی صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے غیر ملکی اشیاء کی درآمد پر یا تو بہت ڈیوٹی لگائی گئی یا اس پ

مکمل پابندی لگادی گئی - دوسری طرف نسل پرستی کے جذبے نے قوموں میں نسلی برتری کے جذبات پیدا کئے 'ان دونوں نظریات کی وجہ سے طاقت ور اقوام نے کمزور قوموں کے حقوق کو پامال کیا -

انیسویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس دور میں قوم پرستی کے جذبہ کے تحت ریاستیں متحد ہو رہی تھیں - ان میں اٹلی اور جرمنی کے علاوہ پولینڈ ' رومانیہ ' یوگوسلاویہ ' بلغاریہ ' یونان ' اور چیکو سلوویکیہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں - مارکس اور اینگلز بڑی ریاستوں کے اتحاد کے حامی تھے - مارکس خود بین الاقوامی ذہن رکھتا تھا اس نے قومی ریاست کی اس وجہ سے مخالفت کی لوگوں کی اس سے وفاداری ہو جائے گی - وہ صرف ایک سیاسی وفاداری کا قائل تھا اور یہ تھی بین الاقوامی مزدوروں کی جماعت اور سوشل ازم - اس نے اس بات پر زور دیا کہ دوسری اقوام کے مزدوروں اور سوشلسٹوں سے اتحاد قائم کیا جائے - اس لئے اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے قومی جذبات اور اس کے کردار کو کم کر کے دیکھا -

یہ صحیح ہے کہ قوم پرستی یورپ کی پیداوار ہے - لیکن کیا نو آبادیاتی ملکوں میں اس نظریہ کو یورپ نے روشناس کرایا ؟ اس کے حامی یہ دلیل دیتے ہیں کہ نو آبادیاتی نظام نے ان ملکوں کی منجمد زندگی پر اثرات ڈالے - گاؤں کی زندگی جو اب تک ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھی اس میں ہلچل پیدا ہوئی - نو آبادیاتی نظام نے مقامی صنعتوں کو ختم کرنا شروع کیا تو بیروزگار لوگوں کی شہروں کی طرف ہجرت کا آغاز ہوا - گاؤں کے لوگ جو اب تک گاؤں کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور اس سے ان کا ذہنی لگاؤ تھا - اب جب کہ وہ شہروں میں آئے تو ان کا ذہن وسیع ہوا - اور ان کی ثقافتی حدود میں اضافہ ہوا کیونکہ یہاں پر مختلف برادریوں اور قبائل کے لوگوں کا آپس میں میل ملاپ بڑھنا شروع ہوا - اس عمل میں جاگیرداری اور دولت مند طبقہ کے بچوں نے مغربی تعلیم حاصل کی اور بطور ڈاکٹر ' وکیل ' انجینیئر ' اور انتظامیہ کے عہدے داروں کی حیثیت سے کام کر کے خود کو امپیریل نظام سے وابستہ کر لیا - اور وہ یورپی نظام کو اپنے لئے نعمت سمجھنے لگے - اور ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مغربی ملکوں کی نگرانی

میں وہ جدید تہذیب و تمدن سے آراستہ ہوئے۔ اسی مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کو نو آبادیاتی نظام میں آہستہ آہستہ حکومتی اختیارات دیئے گئے اور یہ ملک اس وقت آزاد ہوئے کہ جب انھیں نگرانی کی ضرورت نہیں رہی۔ اس دلیل کے تحت نو آبادیاتی ممالک کی آزادی کسی جدوجہد کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ان کے لئے تحفہ ہے جو انھیں اس وقت ملا جب کہ ان میں عقل کی پختگی آگئی۔

اس کی مخالفت میں جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نو آبادیاتی نظام نے اپنے ماتحت ملکوں میں آزادی، حقوق انسانی، اور جمہوری اداروں کا خاتمہ کیا۔ کیونکہ اس نظام کی بنیاد جمہوری اقدار پر نہیں بلکہ تشدد پر تھی۔ وہ لوگوں سے مکمل وفاداری اور اطاعت چاہتے تھے اور انھیں ہمیشہ کے لئے اپنے ماتحت رکھنا چاہتے تھے۔ اس رویہ اور استحصال کے نتیجہ میں قومی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اور اس طرح ان کی جڑیں مقامی لوگوں کے اندر تھیں۔

اگر پہلے والی دلیل کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یورپ نے آزادی اور جمہوریت کو ایشیاء و افریقہ کے ملکوں میں پھیلایا۔ اور ان ملکوں میں قوم پرستی نو آبادیاتی نظام کے استحصال کے نتیجہ میں پیدا نہیں ہوئی بلکہ یہ یورپی تعلیم اور افکار کی وجہ سے ہوئی کہ جس نے انھیں روشن خیال بنایا اس طرح ان ملکوں کی آزادی یورپ کی دی ہوئی ہے۔

نو آبادیات میں قومی تحریکوں میں تین طبقوں کے درمیان تصادم تھا۔ ایک طرف والیان ریاست، زمیندار و جاگیردار، اور پرانے حکمران تھے کہ جن کے مفادات امپیریل طاقتوں کے ساتھ تھے اور وہ ان کی حمایت کر کے اپنی مراعات کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف غیر ملکی اقتدار تھا جو اس طبقہ کی حمایت سے اپنے اقتدار کو مستحکم کئے ہوئے تھا۔ ان دو طبقوں کے مخالف قوم پرست طبقے تھے جن کی اکثریت کا تعلق متوسط طبقہ سے تھا۔ یہ آزادی اور قومی اتحاد کے علم بردار تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ قبائلی، ذات پات، اور مذہبی فرق کو مٹا کر عوام کو متحد کیا جائے کیونکہ بغیر عوامی طاقت اور جدوجہد کے یہ امپیریل طاقت سے نہیں لڑ سکتے تھے۔ اس وجہ سے یہ امپیریل طاقت کے مفاد میں تھا کہ وہ عوام میں فرقہ وارانہ اختلافات کو ابھارتی رہیں تاکہ ان میں اتحاد نہ ہو اور قوم پرستی کے جذبات

اس لئے قوم پرست طبقوں کی کامیابی کا دارومدار اس پر تھا کہ وہ کس حد تک اور کس طرح سے لوگوں میں ایک قوم ہونے کا احساس پیدا کریں- اس لئے انھوں نے اس پر زور دیا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے اور اس کا مقصد قومی وقار کا تحفظ ہے- اس مقصد کے لئے انھوں نے غیر ملکی اقتدار ' اس کے رویہ ' اور اس کے استحصال کو عوام کے سامنے اس طرح سے پیش کیا کہ ایک طرف ان میں مظلوم ہونے کا احساس پیدا ہوا اور دوسری طرف ان کے استحصال سے نفرت-

قومی اتحاد اور قومی فخر کو پیدا کرنے کے لئے تاریخ کا سہارا لیا گیا- اور ہر قوم نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنا شاندار ماضی تشکیل کریں جس کی بنیاد پر خوش آیند مستقبل کے لئے کام کیا جائے آزادی کی تحریک اور جنگ کے دوران جو شخصیتیں ابھریں انھیں قومی ہیرو بنا کر پیش کیا- وہ بہت سے ملک جہاں آزادی کی طویل جنگ نہیں لڑی گئی وہاں انھوں نے مزاحمت کی تحریک کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا اور قربانیوں اور جدوجہد کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا- بعد میں ان شخصیتوں اور ان کے خاندانوں نے ان قربانیوں کا صلہ ملک و قوم سے سیاسی اقتدار ' اور دوسری مراعات کی صورت میں وصول کیا- اس طرح تاریخ میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کیا اور اس دنیا میں بھی تمام مادی سہولتیں حاصل کیں-

نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ پر جب قومی ریاست کی تشکیل کا کام شروع ہوا تو نئی قوم نے سب سے پہلے قومی شناخت کی علامتوں کو اختیار کیا- ان میں جھنڈا ' اور قومی ترانہ قابل ذکر ہیں- جھنڈے کے رنگ اور اس کے نشانات میں قومی مشن ' اور امنگوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی- قومی ترانہ میں زمین ' وطن ' اور قوم سے محبت کے جذبات کو ابھارا گیا- دوسرے مرحلے میں نو آبادیاتی دور کے نام بدلے گئے- شاہراہوں ' گلیوں ' عمارتوں ' اور باغوں کے نام قومی ہیروز کے نام پر رکھے گئے- شہروں کے نام بدل کر ان کے قدیم ناموں سے پکارا جانے لگا- اکثر ملکوں نے نئے دارالحکومت تعمیر کر دیئے تاکہ ان کی خوبصورتی اور شان و شوکت میں ملک کی غریبی و مفلسی کو چھپایا جا سکے اور حکمران طبقے عوام سے کٹ کر ایک

علیحدہ جزیرہ بنا کر وہاں سکون و آرام سے رہ سکیں -

قومی ریاست کی تشکیل میں قومی شاعر نے بھی اہم حصہ لیا - جسے یہ اعزاز دیا گیا اگر اس کی شاعری قومی جذبات کی عکاسی کرتی ہو تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی - ورنہ اس کے ان پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا گیا جو قوم پرستی کے لئے موزوں نہیں تھے - شاعر کے ساتھ مصور' ادیب' فنکار اور موسیقار بھی تلاش کئے گئے کہ جن کے فن پاروں کی بنیاد پر قومی ثقافت کی تعمیر کی گئی -

نئے آزاد ہونے والے ملکوں میں قومی زبان ایک مسئلہ بن کر ابھری - کیونکہ ان میں سے اکثر ملکوں میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی تھیں - اس لئے دوسری زبانوں کو نظرانداز کر کے کسی ایک زبان کو قومی بنانا مشکل تھا - یورپ میں یہ اس لئے آسان ہوا کہ وہاں اکثر ملکوں میں ایک زبان بولی جاتی ہے - مثلاً جرمنی ۳۵۰ ریاستوں میں بٹا ہوا تھا مگر اس کی زبان ایک تھی - اس کے مقابلہ میں نائیجریا میں ۴۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں - اس لئے زبان کے مسئلہ پر ان ملکوں میں جھگڑے و فسادات ہوئے اور اکثر ملکوں میں یہ مسئلہ اب تک ناقابل حل ہے -

نئے آزاد ہونے والے ملکوں میں قومی تحریکوں کے نتیجہ میں طاقتور شخصیتیں ابھریں کہ جنھوں نے شخصی حکومتیں قائم کر کے جمہوری عمل اور اقدار کو بری طرح پامال کیا - انھوں نے اپنی آمرانہ حکومتوں کی بقاء کے لئے اس بات کی کوشش کی کہ عوام میں قوم پرستی کے ان جذبات کو زندہ رکھیں کہ جن کی بنیاد پر انھوں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جنگ لڑی تھی - ان جذبات کو زندہ رکھنے کے لئے انھوں نے ملی نغموں' اور قومی ترانوں کا سہارا لیا جو ریڈیو اور ٹی - وی کے ذریعہ مسلسل لوگوں کو سنائے جاتے ہیں -

آزادی کے بعد قومی حکومتوں کی ناکامی کے نتیجہ میں عوام پر یہ واضح ہو گیا کہ غیر ملکی اقتدار سے آزادی ان کی صحیح آزادی نہیں تھی - اور انھیں ایک آزادی کی جنگ اپنے حکمران طبقوں سے لڑنا ہے - چنانچہ ردعمل کے طور پر ان ملکوں میں کہ جہاں کئی قومیں بستی تھیں وہاں لسانی اور نسلی بنیادوں پر قوم پرستی کی ایک نئی تحریک پیدا ہوئی جس نے قومی

سوال کو پیدا کیا - دوسرے اس بات کی کوشش ہوئی کہ طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ ریاست کی تمام قوموں کے مظلوم طبقوں کو متحد کر کے حکمران طبقوں سے جنگ لڑی جائے اس سلسلہ میں روزا لکزمبرگ نے کہا کہ وہ معاشرہ جو طبقات میں تقسیم ہو اس میں قوم سماجی و سیاسی حیثیت سے وجود میں نہیں آسکتی - ہر قوم میں کئی طبقے ہوتے ہیں جن کے متضاد مفادات ہوتے ہیں - کسی بھی صورت میں پرولتاری اور بورژوا طبقوں کے مفادات ایک نہیں ہو سکتے یہ ضرور ہوا کہ جب نو آبادیات میں غیر ملکی اقتدار سے جنگ لڑی گئی تو یہ تمام طبقے قوم پرستی کے تحت ایک ہو گئے مگر آزادی کے بعد پھر یہ ملک حکمران اور مظلوم طبقوں میں بٹ گئے، اور حکمران طبقوں نے عوام کو اقتدار یا مراعات میں شریک کرنے سے انکار کر دیا -

اس لئے روزا لکزمبرگ کی یہ دلیل ہے کہ قوم پرستی ایک رجعت پرست نظریہ ہے جو ہمیشہ پیٹی بورژوا کو اپیل کرتا ہے - ایک ایسے معاشرہ میں کہ جہاں صنعتی مزدور طبقہ مکمل باشعور نہ ہو وہاں سوشل ازم اور نیشنل ازم کی جنگ میں سوشل ازم شکست کھا جائے گا -

برطانوی دانشور ہابس بام نے موجودہ دور میں قوم پرستی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کا اشارہ کیا کہ انیسویں صدی میں اس نظریہ کے تحت ریاستیں متحد ہو رہی تھیں مگر موجودہ زمانہ میں بڑی ریاستیں ٹکڑوں میں بٹ رہی ہیں اور چھوٹی ریاستیں پیدا ہو رہی ہیں - اس وقت قومی تحریکوں کا مقصد یہ ہے کہ بڑی ریاستوں کو تقسیم کیا جائے -

اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ چھوٹی ریاستوں کی تشکیل سے پرولتاری طبقہ کمزور ہوتا ہے - جب بڑی ریاست ٹوٹتی ہے اور علاقے علیحدہ ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی بورژوا طبقے طاقت حاصل کرتے ہیں اور پرولتاری ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان کے مرہون منت ہو جاتے ہیں آج کے دور میں جب کہ بین الاقوامی کارپوریشنیں دنیا کی معیشت پر قبضہ کئے ہوئے ہیں کوئی قومی ریاست خود مختار نہیں ہو سکتی ہے - اس صورت میں مقامی بورژوا ان کی ایجنٹ بن کر عوام کو لوٹتی ہے - لہٰذا اب جب کہ سرمایہ

داری بین الاقوامی بن چکی ہے وہ چھوٹی اور بڑی ریاستوں کی سرحدوں کو توڑ دیتی ہے۔اس لئے ریاستوں کا وجود ناقص ہو گیا ہے۔ ایسے میں چھوٹی ریاستیں بنانا بین الاقوامی سرمایہ داری کو مضبوط کرنا ہے اور یہ ایک رجعت پرستانہ اقدام ہے۔

قومی سوال اور علیحدگی کی تحریکوں کو حل کرنے کے لئے کثیر القومی ریاست کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی قومیتوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق اور مراعات دے کر انھیں جمہوری عمل میں شریک کریں کیونکہ صرف اسی صورت میں انھیں وطن سے لگاؤ اور محبت پیدا ہو گی۔ لیکن اگر اکثریت نے طاقت کے ذریعہ اپنے حصہ سے زیادہ لیا اور چھوٹی قومیتوں کے حقوق کو غصب کیا تو اس صورت میں قومی یک جہتی برقرار نہیں رہے گی اور ملک کو تقسیم کی طرف لے جائے گی جو کسی بھی ملک اور قوم کے لئے المیہ ہو گا۔

پاکستان میں قومیتی مسئلے کا تجزیہ

پاکستان ایک ملک ہے ایک قوم نہیں - قوم کی تشکیل کے لئے جو تاریخی عمل ضروری ہوتا ہے وہ پاکستان میں شروع نہیں ہوا ' اور قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کی بنیاد نہیں پڑی - اس لئے پاکستان میں موجودہ صورت حال میں چار قومیتیں ہیں جو اپنی زبان ' تہذیب ' ثقافت ' نسلی ہم آہنگی اور جغرافیائی حدود کی بنیاد پر اپنی شناخت برقرار رکھے ہوئی ہیں -

پاکستان میں ابتدا ہی سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ مذہب کی بنیاد پر ایک قوم کا تصور پیدا کیا جائے ' مگر معاشی و سیاسی مفادات کی وجہ سے یہ تمام کوششیں ناکام رہیں - پاکستان کی اپنی کوئی ایک زبان بھی نہیں جو ان چاروں قومیتوں کو باہم ملا سکے - جمہوری اداروں کے فقدان اور اظہار رائے پر پابندی کی صورت حال میں ایک قوم بننے کا عمل شروع نہیں ہو سکا - جس کی وجہ سے ہر قومیت اپنی جداگانہ شناخت کے لئے جدوجہد کر رہی ہے -

قوم پرستی کے جذبات مثبت اور منفی دونوں قسم کے عمل کو موثر بناتے ہیں ' ان جذبات کے تحت قومیں آزادی کی جنگ لڑتی ہیں - سامراج کے خلاف جدوجہد کرتی ہیں - سیاسی ناانصافیوں کے خلاف جہاد کرتی ہیں اور اپنے حقوق کے حصول کے لئے کوششیں کرتی ہیں - لیکن اگر قوم پرستی کے جذبات کو انتہا پرستی تک لے جایا جائے اور نسلی برتری اور تہذیبی فضیلت کو ذہنوں میں راسخ کیا جائے - تو یہ جذبات فاشزم اور صیہونیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں -

اس لئے اس موقع پر یہ اہم سوال ذہن میں آتا ہے کہ پاکستان میں قومیت کی تحریکیں کون سا کردار ادا کر رہی ہیں ؟ اور ان تحریکوں کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں ؟ پاکستان میں قومیتوں کے جذبات اور تحریکوں کی ابتداء مرکز کے وسیع اختیارات کے سبب ہوئی - جب پنجاب کے حکمران طبقوں نے فوج ' بیوروکریسی اور صنعت و حرفت پر

مکمل قبضہ کر لیا تو چھوٹے صوبوں کے وہ طبقے جنہیں اقتدار میں شریک نہیں کیا گیا' انہوں نے قومیتوں کی تحریک کو فعال بنانے میں بھرپور حصہ لیا۔

اس طرح قومیتوں کی تحریک کے روح رواں اوپری اور متوسط طبقوں کے افراد ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہ انہیں حکومتی اداروں میں ملازمتیں دی جائیں' سیاسی اداروں میں نمائندگی دی جائے' صوبوں میں مکمل خود مختاری ہو' تاکہ صوبوں کے انتظام کو وہ چلا سکیں اور صنعت و حرفت کے قیام کے لئے ان کی مدد کی جائے۔ اس لئے قومیتوں کی تحریک میں دو باتیں بڑی اہم ہیں ایک طرف اوپری اور متوسط طبقے اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف وہ ان تحریکوں کو وسیع کرنے کی خاطر اور ان میں عوام کو شامل کرنے کی خاطر ان کی بنیاد وسیع ثقافتی عناصر پر رکھنا چاہتے ہیں۔

لیکن جب ثقافت یا کلچر کی بات ہوتی ہے تو وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہر قوم میں دو قومیں ہوتی ہیں اور ان دونوں قوموں کے مختلف کلچر ہوتے ہیں ان تحریکوں کی رہنمائی کرنے والوں کا تعلق ان طبقوں سے ہے کہ جن کے مفادات میں ان ثقافتی اداروں اور روایات کا تحفظ شامل ہے کہ جن کی بنیادوں پر یہ اپنی مراعات کو برقرار رکھ سکیں اور جب حکومتی اداروں اور اقتدار میں شریک ہونے کا وقت آئے تو اس میں صرف انہیں موقع ملے' اور وہ اپنی قوم کی نمائندگی کر سکیں۔ اس لئے قومیتوں کی تحریک میں استحصالی اداروں اور روایات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا جاسکتا' بلکہ ان کو ثقافتی اہمیت دے کر ان کی خوبی اور شان کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ ان میں جاگیرداری' پیر پرستی' مزار و عرس اور سجادہ نشینی' خاندانی شرافت و فضیلت' جیسے اہل سادات وغیرہ اور علماء مشائخ اور صوفی ہیں۔ ان اداروں اور روایات کو قومی ثقافت اور اس کا ورثہ سمجھ کر ان کی حفاظت کی جارہی ہے اور انہیں فروغ دیا جارہا ہے۔ دلچسپ چیز یہ ہے کہ حکومت بھی ان جذبات سے فائدہ اٹھا رہی ہے کیونکہ یہ تمام حکمران طبقوں کے مفاد میں ہے کہ ان استحصالی اداروں اور روایات کو باقی رکھا جائے تاکہ موجودہ نظام مستحکم و مضبوط رہے' اسی وجہ سے مزاروں پر چادریں چڑھانے' عرس منانے' اور جاگیرداروں اور پیروں کی سرپرستی و حفاظت کی جارہی ہے۔

جب ایک مرتبہ یہ تمام ادارے قومیت کے نام پر اس کی علامت بن جاتے ہیں تو ایک عام آدمی کے لئے ان کے لئے احترام اور تقدس پیدا ہو جاتا ہے اور وہ انہیں اپنی قومی روایات کا حصہ سمجھ کر ان سے نہ صرف محبت کرتا ہے بلکہ انہیں مقدس سمجھ کر ان کا دفاع بھی کرتا ہے۔

اس وجہ سے قومیتوں کی تحریک کے زیر اثر جو تاریخ لکھی جا رہی ہے اس میں شخصیتوں کو بطور ہیرو پیش کر کے عوامی جدوجہد اور کوششوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور تاریخ کی تشکیل کا سہرا بڑی بڑی ہستیوں کو پہنایا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے عوام میں خود اعتمادی کا جذبہ کم ہو رہا ہے۔

دوسری جانب اوپری متوسط طبقے ان تحریکوں کے ذریعہ حکومت پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ ملازمتوں میں حصہ دیا جائے۔ اس طرح سے یہ ان ملازمتوں کے ذریعہ اپنے بہترین اور باصلاحیت افراد کو حکومتی نظام کا ایک حصہ بنا رہے ہیں۔ ہوتا یہ رہا ہے کہ جب ایک مرتبہ یہ استحصالی نظام کا ایک حصہ ہو جاتے ہیں اور حکومت کے اقتدار میں انہیں شریک کر لیا جاتا ہے تو پھر یہی لوگ سب سے زیادہ حکومت اور استحصالی نظام کے حامی ہو جاتے ہیں۔ اور انتہاپسند حمایتیوں کا کردار ادا کر کے یہ اپنے ہی لوگوں کو کچلتے اور انہیں ان کے حقوق سے محروم کرتے ہیں۔

اس لئے ان قومیتوں کی تحریک کی ساخت میں ایک طرف طبقاتی مفادات ہیں تو دوسری طرف عوام کی شمولیت کی خاطر انہیں ثقافتی رنگ دیا جاتا ہے اور اس ذریعہ سے اوپری اور متوسط طبقے اپنے استحصالی اداروں کا تحفظ کرتے ہیں قومیتوں کی تحریک میں ان نعروں کو استعمال کیا جاتا ہے کہ جن کا تعلق عوام کے بنیادی مسائل سے نہیں۔ غربت، مفلسی اور حیات اور نچلے و دبے ہوئے طبقوں کے مسائل کے بجائے بحرانی اور وقتی مسائل کو ابھارا جاتا ہے اور ان کی بنیاد پر یہ حکومت سے معاہدہ کرنے کی طاقت کو مضبوط کرتی ہیں۔ اس لئے ان بحرانی مسائل کے خاتمہ کے بعد یہ تحریکیں اچانک انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں اور پھر کسی اور بحران کا انتظار کرتی ہیں، جیسے ون یونٹ کے خاتمہ کے بعد سندھ و

بلوچستان اور سرحد کی تحریکیں دم توڑ گئیں - اس کی وجہ ہے کہ ان کی جڑیں نہ عوام میں ہیں اور نہ انہوں نے عوام کے مسائل کو ابھارا ہے -

اپنے اس رجعت پسندانہ اور طبقاتی مفادات کی وجہ سے قومیتوں کی تحریکیں پاکستان میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر سکیں ' نہ تو ترقی پسند سوچ پیدا کر سکیں نہ طبقاتی کش مکش اور تضادات کو ابھار سکیں اور نہ ہی نچلے اور استحصالی طبقوں میں کوئی شعور پیدا کر سکیں -

جب تک یہ تحریکیں اوپری اور متوسط طبقوں سے نکل کر نچلے طبقوں میں نہیں آئیں گی اور جب تک طبقاتی کش مکش کے ذریعہ حقوق کی جنگ نہیں کی جائے گی اس وقت تک ملک اور معاشرے کے نظام کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہو گا - جب ایک مرتبہ طبقاتی مفادات ختم ہو جائیں گے تو اس کے بعد قومیتوں کے مسائل بھی آسانی سے حل ہو جائیں گے اور ان کی زبان ' ثقافت اور تہذیب ' کو خود بخود فروغ دے گا -

پاکستان میں اس وقت قومیتوں کے درمیان جو تضادات ہیں ان کی بنیاد کلچر ثقافت یا تہذیب پر نہیں بلکہ معاشی مفادات پر ہے پنجاب کے حکمران طبقے اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے چھوٹی قوموں کو دبائے ہوئے ہیں - اگر ان معاشی تضادات کو طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ دور کر دیا گیا تو اس صورت میں قومیتوں کی ثقافت کی ترقی کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی -

پاکستان میں قومیتوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان کے ذمہ دار پنجاب کے حکمران طبقے ہیں اس لئے ان کے ساتھ عوام کو شامل کرنا اور پوری پنجابی قوم کو الزام دینا درست نہیں ہے کیونکہ اگر بحیثیت مجموعی پنجابی قوم کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کے رد عمل میں پنجابی قوم پرستی شدت اختیار کر لے گی اور اس صورت میں چھوٹی قومیتوں کے لئے یہ مشکل ہو جائے گا کہ وہ قوم پرستی کی بنیاد پر پنجابی قوم سے مقابلہ کر سکیں کیونکہ پنجاب اپنے طبقاتی تضادات کو ختم کر کے قومیت کی بنیاد پر متحد ہو جائے گا اور زیادہ شدت سے وہ چھوٹی قومیتوں کا استحصال کرے گا - اس لئے پنجابی قوم پرستی کے جذبہ

کو کمزور کرنے کے لئے ضروری ہے اس کے نچلے اور نچلے طبقوں سے ابھار کر کے

طبقاتی تضادات کو ابھارا جائے کیونکہ صرف اس صورت میں پنجاب کے حکمران طبقے رہ جائیں گے اور یہی تنہائی ان کی سب سے بڑی کمزوری ہو گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں چھوٹی قومیتوں میں قوم پرستی کا جذبہ پنجابی حکمران طبقوں کے استحصال کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ اب اگر سندھی قوم کے حکمران طبقے اپنی ثقافتی اور مذہبی اقلیتوں کے ساتھ یہی رویہ اختیار کریں گے تو اس کے رد عمل میں ایسی تنظیمیں پیدا ہوں گی کہ جو لسانی بنیادوں پر اپنی شناخت کے لئے جدوجہد کریں گی۔ سندھ میں آنے والے اور آباد ہونے والے مہاجروں میں دو فیصد تعداد ان موقع پرستوں کی تھی کہ جو یہاں معاشی فوائد کے لئے آئے تھے اور اس تعداد نے جھوٹے کلیموں کے ذریعہ فوائد حاصل کئے۔ مگر ان کے علاوہ اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ جو فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجہ میں یا اس عدم تحفظ کے ڈر سے کہ جو تحریک پاکستان کے دوران ان میں پیدا کر دیا تھا۔ پاکستان میں آئے اور آج بھی یہ اکثریت کراچی و حیدر آباد کی کچی آبادیوں میں اور متوسط درجہ کی بستیوں میں آباد نظر آئے گی۔

اگر اکثریت کو یہ مشورہ دیا جائے کہ اقلیتی گروہوں کو وہ اپنی مرضی سے رکھے اور اقلیت سے کہا جائے کہ وہ اکثریت کے دباؤ میں رہے تو پھر میرا خیال ہے کہ اس دلیل کے تحت پنجابی حکمران طبقے بھی غلط نہیں کر رہے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ طاقت، جبر اور ظلم کے ساتھ کسی گروہ کو زیادہ عرصہ تک دبا کر نہیں رکھا جا سکتا ہے اور اس کے رد عمل میں ہی قوم پرستی کے منفی اثرات ہوتے ہیں۔ جو جبر کا حل علیحدگی میں ڈھونڈتے ہیں۔ سندھو دیش کا نعرہ بھی اس رد عمل کا نتیجہ ہے اور آگے چل کر مہاجر صوبہ کا مطالبہ بھی اس ذہنیت کی پیداوار ہو گا۔

سندھ کے مہاجروں میں اس وقت ایک زبردست تبدیلی آئی ہے۔ کیونکہ وہ نسل جو ہجرت کر کے آئی تھی وہ ختم ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اس کی ذہنیت بھی دم توڑ رہی ہے۔ نئی نسل جو سندھ میں پیدا ہوئی ہے اس کا تعلق اب زمین سے ہے اور اس کا جذباتی

لگاؤ اور رشتہ اس سے وابستہ ہے۔ اس لئے وہ اب سندھ کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھتے ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سندھی اور اور مہاجر ملاپ کی راہیں تلاش کی جائیں ان کے اختلافات کو ہوا نہ دی جائے۔ اس لئے جیسا کہ پاؤلو فیرو رو نے کہا ہے کہ ہر مظلوم کے اندر جو ظالم چھپا ہوا ہے اسے مارنے کی ضرورت ہے۔ اگر مظلوم صاحب اقتدار ہونے کے بعد اپنے اندر کے ظالم کو آزاد کر دے گا تو پھر معاشرہ میں کبھی انصاف قائم نہیں ہو سکے گا۔

جس طرح پاکستان بننے کے بعد یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ ہمارے حکمران طبقے ان مسائل کا حل کریں گے جو نو آبادیاتی دور میں پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ نو آبادیاتی نظام کے قیام اور استحکام میں ان کا مفاد تھا۔ اس لئے پاکستان کے چاروں صوبوں میں جو غیر مساوی ترقی ہوئی وہ ان کے مفاد میں تھی۔ اس لئے آج یہ توقع رکھنی فضول ہے کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے قومیتوں کی ناانصافیوں کو دور کیا جا سکے گا۔ اس لئے حکمران طبقوں سے اپیل کرنی اور ان کے سامنے اصلاحات کا چارٹر پیش کرنا، دونوں باتیں بے سود ہیں۔ حقوق درخواستوں اور قراردادوں سے نہیں ملتے بلکہ اس کے لئے عوامی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کی قیادت عوام کے ہاتھوں میں ہو تاکہ وہی اس کے نتائج سے فائدہ اٹھا سکیں۔

تاریخِ پاکستان: قدیم دور ـــــ ایک تبصرہ

پاکستان میں تاریخ نویسی حکومت اور سیاسی تقاضوں کے ماتحت ہے - جس طرح عہد وسطیٰ میں مورخ دربار اور بادشاہ کے سرکاری ملازم ہوا کرتے تھے اور ان کے نقطہ نظر سے تاریخ لکھتے تھے - پاکستان بننے کے بعد بھی یہی کچھ ہوا - اور ہمارے مورخوں نے بھی حکومت کے احکامات کے تحت تاریخی نقطہ نظر کو تشکیل دینے کی کوشش کی اور حکمران طبقوں کے سیاسی مفادات کے تحت تاریخیں لکھیں - پاکستان کی تاریخ کے ابتدائی دور میں تو ہمارے حکمرانوں کو ہمارے مورخوں کی اہلیت پر شبہ تھا - اس لئے انھوں نے بانی پاکستان کی سوانح ہیکٹر بولیتھو سے لکھوائی - اور پاکستان کی قدیم تاریخ کا کام موتمر وھیلر کے سپرد ہوا کہ جنھوں نے "پاکستان کے ۵ ہزار سال" نامی کتاب لکھی -

جب ایوب خاں بر سر اقتدار آئے تو انھوں نے پاکستان کے مورخوں کی ایک میٹنگ طلب کی اور اس میں اس خیال کا اظہار کیا کہ پاکستان کی تاریخ کو قومی نقطہ نظر سے لکھنا چاہئے - اور خصوصیت سے اس خطہ کی تاریخ کہ جس کا نام اب پاکستان ہے اس کے قدیم تمدن کے بارے میں تحقیق ہونی چاہئے - چنانچہ ان امکانات کے تحت اشتیاق حسین قریشی 'ڈاکٹر احمد حسن دانی' اور دوسرے مورخوں نے پاکستان کی تاریخ کو اس نقطہ نظر سے لکھا کہ جس میں برصغیر ہندوستان میں ہونے والے تاریخی واقعات کا مرکز اس خطہ کو بتایا کہ جس کا نام ۱۹۴۷ء میں پاکستان پڑا - اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس طرح سے خطہ کی ایک علیحدہ شناخت قائم کی جائے اور اس کی علیحدہ تاریخی حیثیت کو تسلیم کرایا جائے - ان کا خیال تھا کہ اس سے پاکستانی قومیت پیدا ہوگی اور اس خطہ کے لوگوں میں جو ثقافتی تعلقات ہیں وہ مضبوط ہو سکیں گے اس وقت مشرقی پاکستان ان مورخوں کے لئے ایک مسئلہ بنا ہوا تھا کہ اسے کس طرح سے اس تاریخ کے ڈھانچہ میں لائیں - مگر اس کی علیحدگی کے بعد اس کا بھی حل نکل آیا -

ایک دوسری کوشش یہ بھی ہوئی کہ اس خطہ کو برصغیر سے کاٹ کر اس کا تہذیبی و

ثقافتی تعلق وسط ایشیا اور مشرق وسطی سے قائم کیا جائے - کیونکہ اس صورت میں یہ ہندو تہذیب سے علیحدہ ہو کر مسلم تہذیب کا ایک حصہ ہو جائے گا - اس کے لئے یہ دلیل دی گئی کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے عہد میں وسط ایشیا اور مشرق وسطی کے نظریات و افکار - اور ثقافتی اثرات بہت گہرے تھے اور ایک لحاظ سے یہ اس تہذیب کا ایک حصہ تھی - اس نقطہ نظر کے تحت ان علاقوں سے جو بھی حملہ آور آئے اور یہاں حکومتیں قائم کیں وہ ہیرو قرار پائے - کیونکہ انھوں نے یہاں پر ایک اعلیٰ اور برتر تہذیب کو روشناس کرایا - اس نقطہ نظر کو ہمارے حکمران اس لئے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد "اینٹی انڈیا" تھی اور پاکستان کو ہندوستان کی جانب سے ہمیشہ اپنے وجود کا خطرہ تھا' اس لئے وہ اپنا دفاع اس میں سمجھتے تھے کہ پاکستان کو تہذیبی و ثقافتی طور پر وسط ایشیا و مشرق وسطی سے ملا دیا جائے اور اس طرح سے عالم اسلام کو متحد کر کے ایک کر دیا جائے -

پاکستان کی تاریخ لکھتے وقت یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ پاکستان ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا - اس لئے پاکستان کے نام سے جو تاریخ لکھی جائے کیا وہ ۴۷ء سے شروع ہو؟ مگر اس سے پہلے کی تاریخ تو پاکستان کی نہیں کیونکہ اس وقت اس کا وجود نہیں تھا - لہٰذا اسے کس نام سے لکھا جائے - اور کیا کہا جائے؟ اکثر سرکاری مورخوں نے یہ دلیل دی کہ چونکہ اب خطہ کا نام پاکستان ہے لہٰذا اس کی قدیم تاریخ کو بھی اسی نام سے موسوم کیا جائے - اور "قدیم پاکستان" کے نام سے انھوں نے یہاں کی قدیم تاریخ اور تمدن کے بارے میں لکھا اور اس مقصد کے تحت لکھا کہ پاکستانی قومیت کی جڑیں ۴۷ء سے آگے عہد قدیم تک گئی ہیں اور ان کا جو ورثہ ہے وہ بڑا پرانا اور قدیم ہے لہٰذا اس پر فخر کی ضرورت ہے -

لیکن کیا قدیم پاکستان کی تاریخ پر فخر کرنا چاہیے؟ یہاں مذہب اور نظریہ پاکستان نے کچھ مشکلات پیدا کر دیں - چونکہ مذہب اسلام کی رو سے - اسلام کی آمد سے پہلے کا تمام زمانہ جاہلیت و تاریکی کا تھا اس لئے اس عہد میں جو بھی تہذیب و تمدن پیدا ہوئے وہ گمراہی اور فسق و فجور سے بھرپور تھے - اس لئے ان تہذیبوں اور تمدنوں کے مطالعہ اور تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں - مذہب اس بات پر زور دیتا ہے کہ انھیں اس حالت میں رہنے دیا جائے اور

ان کے قدیم کھنڈروں اور آثار سے عبرت حاصل کی جائے - اس نقطہ نظر سے تاریخ کا

[illegible]

عمل اسلام کی آمد کے بعد سے شروع ہوتا ہے - اس لئے اس کے بعد کی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت ہے - اس لحاظ سے برصغیر کی تاریخ میں اس کی ابتداء محمد بن قاسم - اور محمود غزنوی کے حملوں سے ہوئی - اس لئے اس سے پہلے کی تاریخ پر نہ تو تحقیق کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کو جاننے کی کیونکہ یہ ہماری تاریخ نہیں - اور ان کا تعلق گمراہی اور تاریکی سے ہے - اس وجہ سے موہنجوڈرو' اور گندھارا کی تہذیبیں ہماری نہیں' اس لئے ان کی شان و شوکت کو بیان کرنا مذہبی نقطۂ نظر سے غلط ہے -

یہ نقطۂ نظر ہمارے ہاں زیادہ مقبول ہے - اور ہماری نصاب کی کتابوں میں قدیم عہد کو نظر انداز کر کے تاریخ کی ابتداء جب ہی سے ہوتی ہے کہ جب عرب اور ترک فاتحین برصغیر ہندوستان میں آئے -

لہٰذا یہ کوشش کہ اس خطہ کی تاریخ کو ۱۹۴۷ء کی سرحدوں میں بند کر کے لکھا جائے' اور صرف انھیں واقعات کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے کہ جو اس خطہ میں پیش آئے تھے - اور انھیں موجودہ دور کے ہندوستان سے کاٹ دیا جائے - یہ تاریخ کا ایک تنگ مفہوم پیدا کرے گی - کیونکہ برصغیر ہندوستان کی تاریخ اپنے میں وسعت اور ہمہ گیریت لئے ہوئے ہے - اشوک - اکبر اور برطانوی عہد میں یہ ایک متحدہ سلطنت رہے ہیں - اور اس پورے تاریخی عرصہ حملہ آور تاجر - مذہبی راہنما - سیاح - خانہ بدوش قبائل اور لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے رہے ہیں - ان کے تہذیبی اور ثقافتی' رشتہ اور رابطے ایک دوسرے سے گہرے ہیں - اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ اشوک - اکبر یا برطانوی عہد کو صرف اس خطہ تک محدود کر دیا جائے اور ان کے دوسرے حصہ کو نظر انداز کر دیا جائے - ۱۹۴۷ء سے پہلے کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ ہے - اور ۱۹۴۷ء سے بعد کی تاریخ کو پاکستان کی تاریخ کہا جا سکتا ہے اور یہ بھی ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلہ دیش کی آزادی کے نتیجہ میں اور محدود ہو گئی -

ہمارے ہاں قدیم تاریخ کو نظر انداز کرنے کا جو رجحان ہے وہ نہ صرف ہمارے ذہنی

نشوونما کے لئے خطرناک ہے بلکہ ہماری قومی شناخت بھی اس کے بغیر نہیں ہو سکتی ہے - قدیم تاریخ کا مطالعہ انسانی ذہن کو وسیع کرتا ہے اور اس کے مذہبی توہمات اور تنگ نظری کو ختم کرنے میں مدد دیتا ہے - کیونکہ اس کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان "ہوموسیپین" سے ترقی کر کے کئی نسلوں میں تقسیم ہوا - اس میں سفید، کالے اور زرد کا کوئی فرق نہیں - بلکہ یہ رنگ علاقوں کی فطری آب و ہوا سے پیدا ہوئے - اس لئے تاریخ میں کوئی گروہ مخصوص برتری کا حامل نہیں - نسل پرستی اور طبقاتی استحصال بعد میں تاریخی عمل کی پیداوار ہیں - اس لئے یہ آفاقی اور ابدی نہیں - معاشرہ میں اقدار، روایات، رسوم و رواج، اور اعتقادات تاریخی عمل کے نتیجہ میں تقاضوں، ضرورتوں، اور مفادات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے یہ ہر زمانہ میں بدلتے رہتے ہیں - پوری انسانی تاریخ اس تغیرو تبدل کا نام ہے -

یہ انسانی تاریخ اس وقت لکھنی ممکن ہے کہ جب کہ تاریخ کو ارتقائی نقطہ نظر سے لکھا جائے اگر مذہبی تخلیق کے نظریہ کو مان لیا جائے تو اس میں کائنات خدا کے حکم سے پیدا ہو گئی اور بس سائنس کے ارتقائی نقطہ نظر سے کائنات کی تخلیق ایک ڈرامہ ہے کہ جس میں زندگی آہستہ آہستہ لحظہ بہ لحظہ پروان چڑھتی ہے اور جیسے جیسے یہ آگے بڑھتی ہے اس طرح سے کائنات کے رنگ بدلتے رہتے ہیں ہر مرحلہ پر ایک انقلاب رونما ہوتا ہے - اور ذہن میں تجسس و جاننے کی خواہشات تیز تر ہوتی چلی جاتی ہیں - ایک جاسوسی کی کہانی کی مانند کی جس میں رازوں پر سے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں اور ذہن ان رازوں سے واقف ہو کر حیران ہوتا چلا جاتا ہے - تاریخ ان ارتقائی مرحلوں کو ریکارڈ کرتی ہے - اور اس پورے عمل میں انسان جدوجہد کرتا نظر آتا ہے - وہ اپنی تاریخ خود بناتا ہے اکیلا و تنہا - بغیر کسی کی مدد کے -

انسانی معاشرہ کی تبدیلیوں کا پتہ آثار قدیمہ سے ہوتا ہے جو معاشرہ کی سماجی، ثقافتی اور معاشی تاریخ کا اہم ماخذ ہوتے ہیں - قدیم عمارتوں، برتنوں، زیورات، اوزار، اور ہتھیاروں کی مدد سے کسی بھی معاشرے کی ذہنی اور شعوری ترقی کا پتہ چلتا ہے - اس لئے

ان کی حفاظت کی جاتی ہے اور قدیم عہد کی اشیاء کو میوزیم میں محفوظ کیا جاتا ہے-

قدیم تاریخ اس بات کی بھی نشان دہی کرتی ہے کہ آخر تاریخ میں قومیں کیوں زوال پذیر ہوئیں؟ تہذیبیں کیوں موت سے ہم کنار ہوئیں؟ آخر کیوں شہر اجڑے - گاؤں ویران ہوئے - اور انسان خانہ بدوش ہوئے؟ کیوں حملہ آور کامیاب ہوئے؟ ان سوالوں کا جواب تاریخی عمل میں پوشیدہ ہوتا ہے اور مورخ کا کام یہ ہے کہ اس کو ظاہر کرے- تاریخ میں جب بھی حکمران طبقوں نے تبدیلی کی مخالفت کی - نئی ایجادات نہ ہونے دیں - اور نظام کو اسی حالت میں برقرار رکھنا چاہا تو اس کے نتیجہ میں معاشرہ ایک جگہ پر ٹھہر گیا- اس کی مثال وادی سندھ کی تہذیب ہے کہ جہاں ہتھیار نہیں تھے - اگرچہ حکمران طبقے اور تاجر ہتھیاروں کے وجود سے واقف تھے اور وہ یہ دوران سفر میسوپوٹامیہ میں دیکھ چکے تھے مگر انھوں نے انھیں اپنے ہاں اس لئے روشناس نہیں کرایا کہ انھیں اپنی مراعات کے چھن جانے کا خطرہ تھا- مگر جب آریہ حملہ آور آئے تو انھوں نے بغیر کسی مزاحمت کے انھیں شکست دے کر ان کی پوری تہذیب کو ختم کر دیا- اس لئے اگر تبدیلی نہ ہو تو تہذیب منجمد ہو کر رہ جاتی ہے اور ایک ضرب سے شیشہ کی مانند چکنا چور ہو جاتی ہے-

قدیم تاریخ قومی جذبہ اور احساس کو پیدا کرتی ہے- کیونکہ جتنا تاریخ کی گہرائیوں میں جایا جائے گا اتنا ہی قوم کے بکھرے ہوئے عناصر میں یگانگت نظر آئے گی - زبان' ادب' موسیقی' رقص' دیومالائی قصے و کہانیاں' اور لوک گیت ان کی بنیاد پر قومی کردار بنتا ہے اور جب تک ان کی جڑوں کو ڈھونڈ کر اوپر نہ لایا جائے ایک سایہ دار درخت نشوونما نہیں پا سکتا ہے- قومیں دھرتی سے ابھرتی ہیں- اس میں ان کے جذبات و احساسات ہوتے ہیں- بقول شوپنہار صرف تاریخ کے ذریعہ قوموں کو مکمل شعور ملتا ہے اور تاریخ قوم کا تشخص جب بناتی ہے جب ماضی کے کارناموں پر سب متفق ہوں- مگر وہ تاریخ قوم کی تشکیل کرتی ہے کہ جس کا تعلق زمین سے ہو- برصغیر کے مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ جب ان میں قوم پرستی کی تحریک اٹھی تو برصغیر کی تاریخ ان کی مدد نہیں کر سکی - کیونکہ انھوں نے اپنی تاریخ کو محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے شروع کیا کہ جس میں جنگ و جدل اور فتوحات کے علاوہ اور کچھ

نہیں - اس سے آگے اس دھرتی میں ان کی جڑیں نظر نہیں آتیں - کیونکہ ان کے ادب، زبان، لوک گیتوں اور کہانیوں میں، اور نہ دیومالائی قصوں کا تعلق اس دھرتی اور زمین سے ہے - اپنی شناخت کے لئے انھوں نے ہمیشہ ہندوستان سے باہر دیکھا - اور ہندوستان کی قدیم تاریخ کو نظرانداز کیا - آج جب کہ مصری، ایرانی، ترک، عراقی، اور شامی اپنی قومیتوں کی بنیادیں اپنے قدیم تمدن اور ثقافت پر رکھ رہے ہیں اور ان پر فخر کر رہے ہیں - کیا ہم پاکستان میں اپنی قدیم تاریخ سے علیحدہ ہو کر اپنی کوئی قومی شناخت بنا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے - اس لئے پاکستانی قومیت کے لئے اور اسکی نشوونما کے لئے قدیم تاریخ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے -

ہندوستان کی تاریخ کی جدید تشکیل برطانوی دور میں ہوئی اس لئے انھوں نے تاریخ کے نقطہ نظر کو اپنے انداز میں پیش کیا - انھوں نے تاریخ سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ ہندوستان پر ہمیشہ غیر ملکی قوموں نے حکومت کی اور خود ہندوستانی حکومت کرنے کے اہل نہیں - انھوں نے خصوصیت سے ہندوستان کی تاریخ میں آریاؤں کی مہتہ قائم کی - اس میں آریہ جو سفید نسل کے تھے، دراوڈین کے مقابلہ میں جو سیاہ فام تھے کامیاب ہوئے - اور یہ کہ اسی کے بعد ہندوستان میں تہذیب و تمدن کی ابتداء ہوئی - اب جدید تحقیق کے بعد آریاؤں کی برتری کا نظریہ غلط ثابت ہو گیا ہے - دیبی پرشاد چٹوپادھیائے نے اس کو چیلنج کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ حقیقت میں ہندوستان میں آریہ کبھی بھی اکثریت میں نہیں رہے - ہندوستان میں اکثریت ڈراوڈین یا دوغلے نسل کے لوگوں کی رہی - اس کے ثبوت میں اس نے ۱۸۷۱-۷۲ء کی مردم شماری کو دیا ہے کہ جس میں ہندوستان کی اکثریت کو قبائلی آبادی کہا گیا ہے جو کہ آریہ نہیں تھے - اپنی اقلیت کو اکثریت میں بدلنے کے لئے آریاؤں کی ہمیشہ کوشش رہی کہ یہاں کے قدیم قبائل کو آریہ بنایا جائے - اس مقصد کے لئے "سنگھ" یا قبائلی اتحاد کو توڑنے پر کوٹلیہ نے ارتھ شاستر میں زور دیا ہے تاکہ انھیں توڑ کر سلطنت کا ایک حصہ بنایا جائے - ان کے اتحاد کو توڑنے کے لئے وہ فوجی اقدامات کے بجائے اس بات پر زور دیتا ہے کہ ان میں شراب، عورت، جھوٹ، اور سازش کے ذریعہ

پھوٹ ڈالی جائے اور ہو سکے تو ان میں خانہ جنگی کرائی جائے - ان کا قتل عام بھی اگر ضرورت ہو تو جائز ہے - شاید اشوک کی کالنگا کی جنگ اس کی ایک مثال ہو -

آریہ بنانے کی ایک مثال بنگال کی ہے کہ جہاں کچھ قبائل کا مذہب تبدیل کر کے انھیں آریہ بنایا' مگر ان کی اکثریت آج بھی اپنے پرانے مذہب پر قائم ہے - چٹوپادھیائے نے یہ بھی ثابت کیا کہ ہندوستان کے اکثر حکمران آریہ نہیں تھے مثلاً موریہ خاندان' بلکہ اکثر حکمرانوں کا تعلق شودر ذات سے تھا (سندھ کے برہمن خاندان کے حکمران چچ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ شودر تھا) شیواجی کا تعلق بھی شودر ذات سے تھا - مگر جب اس کی تخت نشینی ہوئی تو اسے کشتری ثابت کیا گیا -

وہ قبائل جنھوں نے آریاؤں کی مزاحمت کی - مگر اس میں ناکام ہوئے - اور اپنے قدیم طرز پر رہتے ہوئے معاشی طور پر پس ماندہ ہوتے چلے گئے - کیونکہ انھوں نے آریاؤں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا اس لئے انھیں آریہ سماج میں نچلے درجہ میں ڈال دیا گیا - اور آج ان قبائل کے نام پس ماندگی' جہالت اور برائی کو ظاہر کرتے ہیں - مثلاً گنوار' کنجر' جٹ' ڈھنگر' چنڈیل' اور جانگلی وغیرہ یہ سب قبائل کے نام ہیں اور آج تک یہ سماج کے نچلے طبقوں میں شمار ہوتے ہیں - اسی طرح داس ایک قبیلہ کا نام تھا جو جنگ میں ہارنے کے بعد غلام بن گیا - اور لفظ داس غلامی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا - یہی صورت حال ہمیں رومی تاریخ میں ملتی ہے جہاں Slave اور Helot دو قبائل اور دو نسلی گروپ تھے جو شکست کے بعد غلام بن گئے - اکثر شودر کو بھی ایک قبیلہ کا نام بتاتے ہیں - اسے بھی نچلی ذات بنا کر سماج میں پست مقام دیا - تاریخ میں بعض اوقات مزاحمت اور سمجھوتہ نہ کرنے کی سزا بڑی سخت ہوتی ہے اور نسلیں اس اذیت سے گذرتی ہیں - مگر آج تاریخ ان مظلوم اور پس ماندہ لوگوں کو ان کا جائز مقام دینے کی جدوجہد کر رہی ہے - اس کی مثال ہندوستان میں دلت تحریک ہے - جو برہمنوں کے اجارہ داری اور ذہنی غلامی کے خلاف بھرپور احتجاج ہے -

ان قدیم قبائل کا سماجی رتبہ عہد برطانیہ میں بھی پست رہا' اور انھوں نے اکثر خانہ

بدوش قبیلوں کے لئے "چور" کی اصطلاح استعمال کی جو کہ سماج اور تاریخ سے ناواقفیت کی ایک دلیل ہے - کیونکہ یہ قبائل فطرت سے جڑے ہوئے تھے اور شہری آبادی سے دور جنگلوں اور غیر آباد علاقوں میں رہتے تھے - اور فطرت سے جو غذا ملتی تھی اسے جمع کر کے استعمال کرتے تھے - یہ فطرت پر اپنا حق سمجھتے تھے اور اس وجہ سے ہر درخت کے پھل ان کے لئے تھے - لیکن جب نجی جائداد نے زمین اور درختوں پر قبضہ جمالیا - تو ان قبائل کو چور کہا کیونکہ یہ ان کے درختوں سے حسب معمول پھل لے جاتے تھے - جب کہ یہ اس لئے ان پر اپنا حق سمجھتے تھے کہ یہ صدیوں پرانی روایت تھی' اور درخت و کھیت ہمیشہ سے ان کے لئے فطرت کا ایک حصہ تھے - اس لئے سوال یہ ہے کہ چور یہ قبائل تھے یا وہ کہ جس نے نجی جائداد کی بنا پر ان پر زبردستی قبضہ کیا؟

ذات پات کی تقسیم کہ جس شکل میں بعد میں ہندو سماج میں وجود میں آئی' یہ آریہ اپنے ساتھ نہیں لائے تھے - بلکہ یہ اس وقت شروع ہوئی کہ جب ہندوستان کے قدیم قبائل ٹوٹے' اور لوگ اپنے پیشوں کے حساب سے تقسیم ہو گئے - آریاؤں میں بھی وہ قبائل جو کہ معاشی طور پر پس ماندہ رہ گئے انھیں انھوں نے "گرے ہوئے" کہا اور ان کا درجہ سماج میں گرا دیا - اس لئے ذات پات کی تقسیم معاشی تھی کہ جسے بعد میں اونچی ذات والوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مذہبی رنگ دیا -

ہندوستان کی تاریخ کی تحقیق کے بعد اب یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل ہندوستان میں تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھا - اس کی مثال یہاں پر بڑے بڑے شہروں کا وجود ہے - خصوصیت سے وادی سندھ کی تہذیب اس کا ثبوت ہے کہ اس دور میں تہذیب و تمدن شہری شکل اختیار کر چکا تھا - آریاؤں کے حملوں نے اس تہذیب کو زبردست نقصان پہونچایا - کیونکہ انھوں نے ان کے شہروں کو تباہ کیا - ان کے زراعتی نظام کو برباد کیا - اور تہذیب کی ترقی کے عمل کو آگے بڑھنے سے روک دیا - ان حملوں کے نتیجہ میں بڑی بڑی سلطنتیں ختم ہوئیں - اور ملک دوبارہ سے جاگیرداری نظام کی طرف لوٹ گیا اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے راجہ و حکمران پیدا ہو گئے - اور معاشرہ کو دوبارہ سے

سلطنت کی شکل اختیار کرنے میں ایک طویل عرصہ لگا - جب آریہ تہذیب و تمدن کی

ابتداء ہوئی اور بعد میں اس کی تشکیل ہوئی تو اس میں دراویڈین اثرات نمایاں ہیں ' جس سے یہ ثابت ہوا کہ فاتح تہذیبی طور پر مفتوحین کے ہاتھوں شکست کھا گئے -

اس پس منظر میں یحییٰ امجد کی کتاب " تاریخ پاکستان - قدیم دور " کا مطالعہ کیا جائے تو ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں - اور کئی سوالات کے جوابات ملتے ہیں - خصوصیت سے اس خطہ کی قدیم تاریخ کا لکھنا اس لئے مشکل ہے کہ اس دور کا کوئی مواد تحریری شکل میں نہیں ملتا - بلکہ سارا دارومدار آثار قدیمہ - سکوں - کتبات - اوزار و برتن اور ہتھیاروں پر ہے کہ جنھیں ہمارے ہاں نہ تو حفاظت سے رکھا گیا ہے اور نہ ان کی کوئی عہدوار ترتیب ہے پورے ملک میں چند میوزم ہیں کہ جن میں سے قدیم اشیاء برابر چوری ہوتی رہتی ہیں - قدیم آثار اور عمارتیں دیکھ بھال کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلسل خستگی کا شکار ہو کر ختم ہو رہی ہیں ' نئے آثاروں کی دریافت کا نہ شوق ہے اور نہ تجسس - ملکی ماہرین کی غیر موجودگی میں غیر ملکی ماہرین ہمارے قدیم آثار دریافت کرتے ہیں ' اور ان سے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کر کے انھیں اسی طرح چھوڑ کر چلے جاتے ہیں - مہرگڑھ کی دریافت میں یہی ہوا - اسے فرانسیسی و اطالوی ماہرین نے دریافت کیا ' اور اس سے معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ انھیں چھوڑ گئے ' مناسب حفاظت اور دیکھ بھال کی کمی کی وجہ سے یہ آثار آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں - یہی کچھ حال بھمبور ' ہڑپہ کا ہوا ' اور اسی صورت حال سے موہنجوڈرو دوچار ہے - نہ تو ہمارے پاس ماہرین ہیں - نہ وسائل اور نہ ان کو محفوظ رکھنے کا جذبہ -

قدیم مقامات سے جو اشیاء ملتی ہیں - اکثر لوگ انھیں یا تو غیر ملکیوں کے ہاتھ فروخت کر کے پیسہ کماتے ہیں یا انھیں اپنے گھروں میں محفوظ رکھتے ہیں - کیونکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب یہ اشیاء میوزیم کو دی گئیں تو وہاں سے بھی غائب ہو گئیں - اس لئے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی صحیح حفاظت غیر ملکی میوزموں میں بہتر ہو سکتی ہے -

لہٰذا جب قدیم تاریخ لکھنے کا سوال آتا ہے تو اس کے ماخذوں کی رسائی اہم سوال ہوتا

ہے اور لامحالہ اس مواد پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو کہ غیر ملکیوں نے جمع کیا ہے۔

قدیم تاریخ کو لکھنے کے لئے تاریخ کا ایک خاکہ اور منصوبہ بنانا بڑا ضروری ہے۔ کیونکہ قدیم عہد کے سرکاری دستاویزات نہ ہونے کی وجہ سے اس عہد کی سیاسی تاریخ یا بادشاہوں کی تاریخ تو لکھی نہیں جاسکتی۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہے کہ بادشاہوں کے بجائے اس عہد کے لوگوں کی تاریخ لکھی جائے' اس کا حل ہندوستان کے مشہور مورخ کوسمبی نے یہ نکالا کہ "تاریخ نام ہے پیداوار کے ذرائع اور ان کے تعلقات کی مسلسل تبدیلیوں کے اس تذکرہ کا جو سنہ وار ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے" اور بقول کوسمبی تاریخ کو اس انداز میں بھی لکھا جاسکتا ہے جو کہ تاریخ کی داستانوں کے ایک سلسلہ سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔

یحییٰ امجد نے اپنی کتاب میں تاریخ کے اس جدلیاتی عمل کو بیان کیا ہے۔ جو کائنات کے وجود میں آنے سے لے کر مسلسل تضادات کے نتیجہ میں برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں کائنات کی ابتداء اور زندگی کے آغاز کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور تخلیق کائنات کے بجائے ارتقائے سائنس کے نظریہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مگر انھوں نے اپنی پوزیشن اس وقت بڑی کمزور کرلی جب ارتقاء کے سلسلہ میں مولانا روم اور اقبال کے خیالات کو بطور دلیل پیش کیا۔ مولانا روم یا اقبال کے ہاں اگر ارتقاء کا ذکر ہے تو اس کی بنیاد مذہب ہے سائنس نہیں۔ اور اس لئے سائنسی دلائل کے ساتھ مذہبی اعتقادات کو ملا دینے سے ان کے بیان میں کمزوری آگئی۔

اس کے بعد مصنف نے اس خطہ میں حجری دور کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچتی ہے کہ اس خطہ میں حجری دور کی ثقافت کے آثار اب تک محفوظ ہیں۔ اس سے اس دلیل کو تقویت ملتی ہے کہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کی اپنی جداگانہ اور علیحدہ بنیادیں تھیں۔ اور انہیں بنیادوں پر اس کی تہذیب آگے بڑھی۔ اور غیر ملکی اثرات ضرور آئے مگر وہ اس تہذیب کا ایک حصہ بن گئے۔ خصوصیات سے بلوچستان میں نشوونما اور پروان پانیوالی مگدروشی ثقافت کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کے بعد وادی سندھ کی تہذیب کا ذکر ہے - اس پر اب تک کافی تحقیقی مواد جمع

ہو چکا ہے - اس تہذیب کی اس وجہ سے جدید تاریخ میں اہمیت ہے کہ اس کی دریافت کے بعد ہندوستان میں تہذیب دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کے مقابلہ میں آگئی اور اس نے نہ صرف آریاؤں کی برتری کے متھ کو توڑا بلکہ ہندوستانی ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کو ثابت کیا- یحیی امجد کے الفاظ میں -

"وادی سندھ کی تہذیب ایک مرتکز اور منظم ریاست اور سلطنت کی پیداوار تھی - اس بات کا سب سے بڑا ثبوت اس وسیع و عریض علاقے میں یکساں اوزان' پیمانے' مہریں' آلات واوزار' رسم الخط' فن تعمیر اور ٹاؤن پلاننگ ہے - بغیر ایک ریاست کے اور بغیر ایک مرکزی حکومت کے اتنی سختی سے ان چیزوں کا نفاذ دور دور علاقوں میں ناممکن ہے - یہ ہرگز رضاکارانہ یا خودرو یا اتفاقیہ نہیں - قانون کی سخت گیری کے تحت ہی یکسانیت جنم لے سکتی ہے "

تاریخ کا اہم عمل قوموں کا زوال ہوتا ہے - وادی سندھ کی تہذیب کا زوال کیوں ہوا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ

"موسمی اور قدرتی تبدیلیوں کے علاوہ آبادی میں زبردست اضافہ ہو گیا ... جو پیداواری ڈھانچہ موجود تھا وہ پورے سماج کی کفالت کرنے سے قاصر نظر آنے لگا - ان حالات میں استحصال برداشت کی حدوں سے باہر ہو گیا اور کسان بغاوتیں ہونے لگیں - تجارتی قافلوں پر ڈاکوؤں کے حملے اور شہروں پر کسانوں کے حملے ہونا فطری سی بات ہے - ان روز روز کی بغاوتوں نے سلطنت کو بے حد کمزور کر دیا - جگہ جگہ ریاستی 'مشنری شکست و ریخت کا شکار ہونے لگی - غلاموں کی بغاوتوں کا لامتناہی سلسلہ وہ بنیادی سبب ہے جس نے سندھ تہذیب اور سندھ سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا "-

اس کے بعد آریاؤں کی آمد' ان کے حملے' ہندوستان کے قدیم معاشرہ کی تباہی' اور پھر آریہ تہذیب کی تشکیل کو بیان کیا ہے کہ جس میں برہمن ایک طاقتور عنصر کی حیثیت سے ابھرتا ہے اور ہندو سماج کو اپنے آہنی پنجہ میں جکڑ لیتا ہے - بالآخر اس کے رد عمل میں

بدھ مت پیدا ہوتا ہے، جو برہمن کی رسومات اور پیچیدہ عبادات کے طریقوں کے خلاف ایک بغاوت تھی - اور اس نے سماج کے ایک بڑے حصہ کو برہمن ازم کی پیچیدگیوں سے نجات دلا کر سادگی کے عمل پر لا ڈالا - تاریخ میں مذاہب، نظریات اور افکار ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں - ٹکراتے ہیں - اور اس کے نتیجہ میں تاریخی عمل برابر آگے کی جانب بڑھتا رہتا ہے -

اس قدیم تاریخ کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ یہ سیاسی نہیں بلکہ ثقافتی اور تہذیبی ہے - اس میں معاشرہ متحرک نظر آتا ہے - کہ جن کی حرکت سے سماج کے تانے بانے بنتے ہیں یہاں پر حکمران طبقوں کی تاریخ پر اجارہ داری نہیں - بلکہ لوگ ہیں جو کہ تاریخ بنانے میں مصروف ہیں -

کسی بھی خطہ کی قدیم تاریخ معاشرہ اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کو ماضی کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے کہ جہاں ان کے وجود کی جڑیں ہوتی ہیں - انھیں سے روایات و ادارے بنتے ہیں - اور تبدیلیوں کے عمل کے باوجود وہ اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہیں - اس کتاب میں اس تہذیبی تسلسل کو برقرار رکھا گیا ہے - اس طرح یہ کتاب اس خطہ کے لوگوں کو اپنی شناخت کی تلاش میں مدد دے سکے گی -

مزاحمتی ادب

دنیا کی تاریخ میں انسان مسلسل جدوجہد کرتا نظر آتا ہے - اس کی یہ جدوجہد معاشرے میں پیدا ہونے والی ناانصافیوں، ظلم و ستم، استحصال، اور محرومیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے - جو چیز انسان کو نہیں ملتی وہ اس کے ذہن میں ایک تخیلاتی شکل اختیار کر لیتی ہے - پھر وہ اس کو حقیقی شکل میں لانے کی جدوجہد کرتا ہے، لیکن کیا انسان ایک ایسی دنیا پیدا کر سکتا ہے کہ جس میں ظلم و ستم و استحصال نہ ہو اور ہر شخص زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے؟ یہ وہ اہم سوال ہے جو معاشرے کے ستائے ہوئے اور مظلوم لوگوں کو امید و بیم کے جذبات میں مبتلا رکھتا ہے - اگر ایک طرف خواہشات و تمناؤں کے پورے ہونے کی امید ہوتی ہے تو دوسری طرف مایوسی و ناکامی کا اندھیرا - معاشرے کی خاموش اکثریت جو جہالت و توہمات اور فرسودہ روایات کے شکنجہ میں جکڑی ہوتی ہے، وہ ان قیدیوں کی مانند ہوتی ہے کہ جو جیل کی اونچی اونچی دیواروں میں گھری آزاد دنیا سے بے خبر ہوتی ہے، اور ان میں جو قوت و توانائی چھپی ہوتی ہے - وہ اس سے واقف نہیں ہوتے - محرومیاں انسان میں مایوسی کے جذبات کو پیدا کرتی ہے، اور انسان میں محرومی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے، اس وقت اسے نہ تو اپنی ذات پر اعتماد رہتا ہے، اور نہ اپنی قوت و طاقت پر -

لیکن صورت حال اتنی مایوس کن نہیں ہوتی ہے، مظلوموں میں اگر شعور پیدا کیا جائے اور انہیں ان کی قوت کا احساس دلایا جائے تو نہ صرف وہ اپنی زندگی بدل سکتے ہیں، بلکہ اپنے معاشرے میں انقلاب لا سکتے ہیں - ان میں قوت کا یہ احساس جدوجہد سے ہوتا ہے، جب یہ ایک بار شروع ہوتی ہے تو سب سے پہلے مایوسی، اداسی، بے بسی، اور مجبوری کے جذبات کو ختم کرتی ہے اور دلوں میں امید پیدا کر کے زنگ آلود خیالات کو صاف کرتی ہے - مایوسی ظالمانہ نظام کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے جب کہ جدوجہد روشن مستقبل کی [illegible] دیتی ہے -

وہ ادب جو معاشرے کی مایوسی دور کر کے مظلوم لوگوں میں جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور زندگی میں مقصدیت کو پیدا کرتا ہے وہی ادب مزاحمتی ادب ہوتا ہے۔ مزاحمتی ادب صرف سیاسی دباؤ اور پابندیوں کے نتیجہ ہی میں پیدا نہیں ہوتا' بلکہ یہ اقتصادی و سماجی استحصال سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ مزاحمتی ادب اپنے اندر ایک بنیادی مقصد رکھتا ہے' اور یہ مقصد معاشرے کو تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ کہ جس میں انصاف و مساوات ہو۔

اس لئے مزاحمتی ادب کی یہ جنگ اس مرحلہ سے شروع ہوتی ہے کہ جب مظلوم لوگ ہر ہتھیار سے محروم ہوتے ہیں اور مخالف قوتیں تمام اسلحہ سے مسلح' یہ جنگ جو کمزور اور طاقت ور کے درمیان شروع ہوتی ہے آہستہ آہستہ' مرحلہ وار' درجہ بدرجہ کمزور کو طاقت ور اور طاقت ور کو کمزور کرتی چلی جاتی ہے۔ مزاحمتی ادب لوگوں کو ذہنی و شعوری پختگی کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ طاقت ور مخالف قوتیں اپنے ہر ہتھیار سے محروم ہو کر شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس جنگ کا ہر لمحہ' اور واقعہ مزاحمتی ادب میں محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی ادب تاریخ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مزاحمتی ادب ہر اس ملک اور معاشرے میں پیدا ہوتا ہے کہ جہاں سماج ظالم و مظلوم کے درمیان تقسیم ہوتا ہے' جہاں سامراج کا تسلط ہوتا ہے' جہاں طبقاتی نظام کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اور ذات پات کا فرق گہرا ہوتا ہے۔ جہاں عوام بنیادی ضروریات سے اور عزت و وقار سے محروم ہوتے ہیں۔ ان حالات میں معاشرے کے باشعور شاعر و ادیب اور دانشوروں میں حالات کو تبدیل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' وہ معاشرے میں ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کو محسوس کرتے ہیں اور ان کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والوں کو مشکل اور کٹھن راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف روحانی و جسمانی کرب سے دوچار ہوتے ہیں بلکہ انہیں اپنی جان و مال اور عزت کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ بیسویں صدی کے ایران میں مزاحمتی ادب پیدا کرنے والے قلم کاروں نے بڑی بڑی قربانیاں دیں' محمد علی نے ملک المتکلمین اور سور اسرافیل کو شاہی باغ میں پھانسی دی

اور جب وہ پھانسی پر لٹکے ہوئے دم توڑ رہے تھے اس وقت وہ بالکونی میں بیٹھا اس سے لطف

اندوز ہو رہا تھا اور اطمینان سے کھانے میں مصروف تھا- رضاشاہ اور محمد رضاشاہ کے دور میں ادیبوں اور شاعروں کے خلاف سزاؤں کا طویل سلسلہ جاری رہا' محمد سعون کریم پور شیرازی' مرتضیٰ کیوان' صد بہرنگی' جلال الاحمد اور خرو گل سرخی ان میں سے تھے جنھیں خاموشی سے قتل کر دیا گیا-

لیکن ان تمام سزاؤں کے باوجود مزاحمتی ادب سے تعلق رکھنے والے ادیب و شاعر اور دانشور اپنی حکومتوں' اور حکمران طبقوں کے جرائم کو دیکھ کر خاموش نہیں ہو جاتے ہیں بلکہ وہ ان کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور انہیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں' اور دوسروں کو بھی اس کرب اور اذیت کا احساس دلاتے ہیں کہ جس سے لوگ دو چار ہوتے ہیں' اور یہی احساس ان جرائم کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرتا ہے اور ان کے خلاف عالم گیر تحریک چلتی ہے-

مزاحمتی ادب تنہا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمیشہ تحریک کا ایک حصہ ہوتا ہے وہ تحریک کہ جو مظلوم اور پسے ہوئے عوام کی آزادی اور حریت کے لئے جدوجہد کرتی ہے مزاحمتی ادب تحریک کو سرگرم اور باعمل کارکن فراہم کرتا ہے اور ان میں ایثار' اور قربانی کے جذبات پیدا کرتا ہے فلسطین و جنوبی افریقہ کی آزادی کی تحریکوں میں مزاحمتی ادب کا بڑا حصہ ہے- یہ تحریک آزادی کے تمام نشیب و فراز' اتار چڑھاؤ' اور امید و بیم کی حالت میں لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے اور ان میں امید کے جذبات کو پیدا کرتا ہے- مزاحمتی ادب میں مایوسی نہیں ہوتی' بلکہ یہ ہمیشہ روشن مستقبل کی خبر دیتا ہے-

یہی وجہ ہے کہ مزاحمتی ادب صاحب اقتدار اور ظالم طبقوں کو ہمیشہ خوف زدہ رکھتا ہے- ان کے لئے اسلحہ سے زیادہ خطرناک شاعروں کے نغمے و گیت اور ادیبوں کی تخلیقات ہوتی ہیں- اسلحہ کا اسلحہ سے مقابلہ کر سکتے ہیں- مگر مزاحمتی ادب کے جواب میں ان کے پاس کوئی ادب نہیں ہوتا کہ جو اس کا مقابلہ کر سکے' اس لئے چاہے کتابوں پر پابندیاں عائد کی جائیں- انہیں شاہراہوں پر جلایا جائے- اور انہیں نصاب و ذرائع ابلاغ سے خارج کیا

جائے - ایسی تحریریں خاموشی سے ہاتھوں ہاتھوں پھیلتی رہتی ہیں - اور دلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں -

سنسر شپ کی پابندیاں اور سختیاں مزاحمتی ادب کی تخلیق کو نہیں روک سکتیں ادیب و فن کاران پابندیوں کے باوجود اظہار کے راستے تلاش کر لیتے ہیں - کہیں وہ علامتوں کا سہارا لیتے ہیں' کہیں اپنی تخلیق کو ترجمہ کہہ کر پیش کرتے ہیں' کہیں مضامین کے فٹ نوٹس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں' اور اکثر ذو معنی الفاظ کے ذریعہ اپنے مطالب کو بیان کرتے ہیں -

ایک زمانہ تھا کہ جب حکومتیں مزاحمتی ادب کو پابندیوں کے ذریعہ ختم کر دیتی تھیں یا اسے محدود کر دیتی تھیں - ہندوستان میں بھگتی تحریک نے ذات پات کے خلاف جو مزاحمتی ادب پیدا کیا اسے سنسکرتی ادب نے حکومت کی سرپرستی میں ابھرنے نہیں دیا' مگر موجودہ دور میں مزاحمتی ادب کو ختم کرنا مشکل ہو گیا ہے' خفیہ چھاپے خانے' اخبارات و رسائل اور پمفلٹوں کے ذریعہ یہ بہت جلدی پھیل جاتا ہے' اور لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جاتا ہے -

یوں تو مزاحمتی ادب تاریخ کے ہر دور اور عہد میں تخلیق ہوا' مگر جدید عہد میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف ایشیا' افریقہ' اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں آزادی کی تحریکوں میں ادیبوں و شاعروں نے نمایاں حصہ لیا - آزادی کے بعد ان ممالک میں مزاحمتی ادب نے ایک بار پھر جدوجہد کا راستہ اختیار کیا' کیونکہ اکثر آزاد شدہ ملکوں میں جمہوری حکومتوں کے بجائے آمرانہ و فوجی حکومتیں قائم ہوئیں اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیا گیا' تو مزاحمتی ادب کے ذریعہ ایک بار پھر ان حکومتوں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج کیا گیا -

موجودہ دور میں مزاحمتی ادب ہر ملک کے ماحول اور ہر سیاسی تحریک کے مطابق تخلیق ہو رہا ہے - مثلاً فلسطین کے مزاحمتی ادب میں ایک طرف تو وہ شاعر و ادیب ہیں جو کہ مقبوضہ علاقے میں اسرائیل کے ظلم و ستم سہ رہے ہیں' اور اس کے خلاف جدوجہد

میں مصروف ہیں دوسری طرف وہ جلاوطن ہیں جو منتشر ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور اپنی وطن کی واپسی میں تحریک کا ہاتھ بٹا رہے ہیں - ان دونوں صورتوں میں فلسطین کی تحریک آزادی کو اس کے مزاحمتی ادب نے سرگرم اور فعال بنا رکھا ہے -

مزاحمتی ادب کی ایک شکل جنوبی افریقہ میں تخلیق ہو رہی ہے کہ جہاں افریقی شدید نسلی و سیاسی تعصبات کا شکار ہیں - اس کے رد عمل میں وہ اپنی شناخت اور اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں اور انکے شاعر و ادیب پہلو بہ پہلو ان کے ساتھ ہیں -

مزاحمتی ادب کی شدید شکل ہندوستان میں اچھوت ذات کے لوگوں کا دلت ادب ہے جو اونچی ذات کے لوگوں کے صدیوں کے ظلم و ستم کے نتیجہ میں پیدا ہوا (دلت کے معنی ہیں نچلے درجہ کے کچلے ہوئے لوگ) صدیوں سے اونچی ذات کے لوگوں نے نچلی ذات کو سیاسی و سماجی ' ثقافتی ' اقتصادی اور تعلیمی طور پر پس ماندہ رکھ رکھا تھا - ہندوستان کی آزادی کے بعد جب نچلی ذات کے لوگوں میں تھوڑی بہت تعلیم آئی - تو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں ان میں ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ ابھرا کہ جو خود تو تعلیم یافتہ تھا مگر اس کے والدین مزدور اور کسان تھے - اس لئے ان کی جڑیں اسی نچلے سماجی نظام میں پیوست تھیں -- اس لئے ان لوگوں نے ایک ایسا مزاحمتی ادب تخلیق کیا کہ جو آگ بھرے سینوں سے نکلا تھا اور جس میں معاشرہ کی روایات و اقدار کے خلاف شدید احتجاج تھا - دلت کے بارے میں گنگادھر پنتوا نے کہا کہ -

" میرے خیال میں دلت کوئی ذات نہیں - دلت وہ ہے کہ جس کا اس ملک کی سماجی اور اقتصادی روایات نے استحصال کیا ہے ' وہ کسی دیوتا ' تناسخ ' روح ' مقدس کتابوں ' تقدیر اور آسمان پر یقین نہیں رکھتا کہ یہ سب ذات پات پر زور دیتے ہیں - دلت تبدیلی اور انقلاب کی علامت ہے " -

ان ذلت کے مارے اور کچلے ہوئے لوگوں کو جب زبان ملی تو انھوں نے ایک ایسا ادب تخلیق کیا کہ جو روح کو لرزا دیتا ہے - اس ادب کے پس منظر میں صدیوں کا کرب اور دکھ ہے ' اس کا اظہار ڈی - ایل کالیکر کے ہاں زبردست انکار کی شکل میں ہے -

نہیں ، نہیں ، نہیں

تین بار نہیں ،

تمہارے معاشی ، سماجی ، سیاسی ، ذہنی ، مذہبی ، اخلاقی اور ثقافتی گندگی پر

تم کہ جو خود کو ہمیشہ ابدی اور ہمیشہ چمکنے والا سورج سمجھتے ہو

مجھے تمہارے چھونے سے متعدی بیماری لگ جاتی ہے

لیکن میں ایک نیا سورج ہوں۔

ایک نئے جذبہ کا مالک ہوں۔

میں تمہاری تہذیب سے انکار کرتا ہوں

تمہارے پرمیشور کے گردینی روایات سے انکار کرتا ہوں

تمہارے مذہبی ادب سے انکار کرتا ہوں

میرے بھائیو!

میں اپنی نفرت کا اعلان کرتا ہوں

میری نفرتیں سمجھوتہ کرنے والی نہیں

اس کی کوئی انتہا بھی نہیں

میں نے ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع کر رکھی ہے

میں جھک سکتا ہوں ، ٹوٹ نہیں سکتا۔

دلت ادب کے ایک مقبول عام گیت میں اس عزم کا اظہار کیا گیا ہے ۔

اٹھو! لوگو اٹھو ، اور ذات پات کی زنجیریں توڑ ڈالو

اٹھو لوگو ، اٹھو ،

ہم مراٹھے ، مہار ، برہمن ، ہندو ، عیسائی

سب بھائی ہیں ۔ انسانیت صرف ایک ہے ،

لیکن پھر کیوں (ہمارے لئے) پانی کو کانٹوں کے ذریعہ علیحدہ کر دیا جاتا ہے

کیوں ہمیں تھوکنے بھی روکا جاتا ہے

مکار - پجاریوں کے ظلم کو آشکار کیا

اٹھو ' لوگو

دلت لوگوں کے آنسوؤں نے تاریخ کے کنوؤں کو بھر دیا ہے

ان کی ذہین نسلوں کو مذہبی لوگوں کی مکاری نے نگل لیا ہے

اب ہمارا سورج جل رہا ہے

اس سے ذات پات کو جلا ڈالو

یہ وہ مزاحمتی ادب ہے جو دلوں سے نکل کر دلوں میں اتر تا ہے - اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ جب مظلوموں اور محروموں کو زبان ملتی ہے تو اس میں کتنی قوت ' طاقت ' شدت اور اثر ہوتا ہے -

جمہوریت اور ثقافت

پاکستان میں جمہوریت کی کیفیت ایسی ہی ہے جیسے گھٹن اور حبس میں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا آئے اور چلا جائے - اور پھر ہمارے سیاسی نظام میں جمہوریت کو محض انتخابات تک محدود کر کے اسے ووٹ لینے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے - عوام کو جذباتی نعروں کے ذریعہ اکٹھا کر کے ووٹ لئے اور پھر انہیں ناقابل استعمال سمجھ کر ایک طرف پھینک دیا' یہی حال ہماری ثقافت کا ہے - ایک ایسے معاشرے میں کہ جہاں طبقاتی نظام ہو وہاں چھوٹے چھوٹے دائروں میں علیحدہ علیحدہ کئی ثقافتیں پیدا ہوتی ہیں - آپس میں جوڑنے والا کوئی رشتہ اور کوئی کڑی نہیں ہوتی -

اس بات کو ہمارے ہاں کم ہی سوچا گیا کہ ثقافت کی تشکیل میں عوام اہم کردار کرتے ہیں - ان کے عمل اور تخلیقی صلاحیتوں سے ثقافت کے تانے بانے بنتے ہیں - اگر عوام کو معاشرے کی تعمیر اور عمل سے علیحدہ کر دیا جائے اور انھیں ناکارہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا جائے تو معاشرہ ان کی توانائی سے محروم ہو جائے گا لوگوں میں معاشرے اور ملک کے لئے اس وقت محبت پیدا ہوتی ہے کہ جب وہ انھیں کچھ دے' ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے' ان کا عزت و احترام کرے' لیکن جب معاشرہ انھیں دینے کے بجائے ہر وقت ان سے چھیننے پر آمادہ ہو' اور جب ان کے جسم بھوک سے کھوکھلے ہو جائیں اور ان کے تن ڈھانپنے کے کپڑے تار تار ہو جائیں اور ہر قدم و ہر مرحلہ پر انھیں ذلیل و خوار کیا جائے تو اس وقت ان کے دلوں کی گہرائیوں میں ملک و معاشرہ کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور ان کے تمام نازک احساسات و جذبات مردہ ہو جاتے ہیں - جب معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو نہ تو معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے اور نہ ثقافت کی -

اس لئے ہمارے حکمراں طبقوں نے ایک خاص قسم کی مصنوعی ثقافت لوگوں پر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کی - انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ قوموں کی ثقافت ہمیشہ نیچے سے پھوٹتی ہے اس کی جڑیں خلا میں نہیں ہوتیں بلکہ زمین کی گہرائیوں میں ہوتی ہیں -

کے لئے سریلی آواز اور خوبصورت موسیقی کی ضرورت نہیں کہ جس کے پس منظر میں برف پوش پہاڑ، آبشار، رنگ برنگے پھول اور سبزہ زار ہوتے ہیں، لیکن ان کے دیکھنے اور سننے والوں کی اکثریت کچی آبادیوں میں گندگی و غلاظت کے درمیان تنگ و تاریک مکانوں میں مفلسی و غربت و محرومی کی زندگی گذار رہی ہوتی ہے - یا پھر دیہاتوں کی وہ اکثریت جن تک یہ آوازیں پہنچتی ہی نہیں -

یہی وہ تضاد ہے کہ جس نے ہمارے معاشرے میں قومی ثقافت کے بجائے طبقاتی ثقافتوں کو پیدا کیا - ہر شہر اپنے محلوں اور رہائشی علاقوں کے لحاظ سے طبقاتی بنیادوں پر تقسیم ہے - ان کا طرز رہائش، غذا، لباس، اور زبانیں جدا جدا ہیں - ایک طرف صاف ستھرے، درختوں سے ڈھکے خاموش و پرسکون اور آلودگی سے پاک محلے ہیں تو دوسری طرف پر پیچ گلیوں اور غلاظت کے ڈھیروں کے درمیان کچے مکانات و جھگیاں ہیں - ایک طرف صحت مند اور شگفتہ چہرے ہیں تو دوسری طرف بھوک کے مارے کملائے ہوئے جسم - ایک طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب و شائستہ لوگ ہیں، تو دوسری طرف جاہل اور غیر مہذب عوام، اور پھر جب یہ کہا جائے کہ "ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز" تو اس سے بڑھ کر جھوٹ کا پروپیگنڈا اور کیا ہو سکتا ہے -

بدقسمتی یہ رہی کہ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں نے اس ثقافتی تضاد کے باوجود معاشرے میں کوئی شعور پیدا نہیں کیا، اور ان کی اکثریت بے مقصدیت اور لایعنیت کا شکار رہی، وہ چند ادیب و شاعر اور دانشور کہ جنھوں نے اس جبر، استحصال اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تو لوگوں نے اسے بھی تفریح سمجھ کر اس پر تالیاں بجائیں - معاشرے کی ناانصافیوں کے خلاف ان میں کوئی غم و غصہ پیدا نہیں ہوا - کیونکہ ان میں سے ایک کے اندر دوسروں کا استحصال کرنے اور لوٹنے کا جذبہ چھپا ہوا تھا - ہمارے معاشرے میں ہر ایک اپنے موقع کا منتظر ہے آج کا مظلوم کل کا ظالم بننے کے لئے تیار ہے -

ان حالات میں معاشرہ ان عوامل کو پیدا کرنے میں ناکام ہو گیا ہے کہ جو ثقافت کی

تشکیل کرتے ہیں - اس لئے اس کی غیر موجودگی میں ایک ایسی ثقافت ابھری ہے کہ جس میں دولت ' عزت و احترام کی علامت بن گئی ہے - اور اس کے حصول کے ہر طریقہ کار کو جائز قرار دیدیا گیا - ان بنیادوں پر ہمارا قومی تشخص ابھرا ہے کہ جس میں منافقت ' مصلحت کوشی ' خوشامد ' اور موقع پرستی بنیادی عناصر ہیں - اس لئے ہمارے مصور و آرٹسٹ جو کل حکمرانوں کی خوشنودی کے لئے خطاطی کر رہے تھے وہی آج کے حکمرانوں کو ان کی تصاویر بنا کر پیش کر رہے ہیں - یہی حال شاعروں اور ادیبوں کا ہے جو قلم کی تجارت کر کے مراعات حاصل کرنے میں مصروف ہیں - یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرہ نے نہ تو کوئی اعلیٰ ادب تخلیق کیا اور نہ ہی فنون لطیفہ میں کوئی اضافہ کیا ' بلکہ تخلیق کی جگہ تقلید کو اختیار کر کے ثقافت کو بھی دوسرے سامان تعیش کی طرح مغرب سے درآمد کر لیا -

قومی تشخص - قوموں کے تخلیقی کارناموں کے ذریعہ ابھرتا ہے ' ان کی فکر ان کی سوچ اور ان کی ثقافت سے جب انسانیت کو فائدہ ہوتا ہے ' تو اس سے قوموں کو دنیا کی تاریخ میں ممتاز مقام ملتا ہے - آج دنیا میں مغربی اقوام کی اسی لئے عزت ہے کہ وہ اپنی تخلیقات سے انسانی تہذیب میں اضافہ کر رہی ہیں ' وہ قومیں جو دنیا کی تہذیب میں کوئی اضافہ نہیں کرتیں - ان کی حالت اقوام عالم میں اچھوتوں کی ہوتی ہے ' اور ہم ان ہی اچھوت قوموں میں سے ایک ہیں -

کیا ایسا کوئی راستہ ہے کہ جس پر چل کر ہم اپنی سوچ ' فکر ' اور ذہن کو تبدیل کر سکیں ؟ یہ راستہ ہے ضرور ' مگر مشکل کٹھن اور دشوار گزار ہے ' جاندار ثقافت کی تشکیل کے لئے جمہوری فکر اور طرز زندگی کی ضرورت ہے ' اور یہ جب تک نہیں ہو سکتا کہ جب تک لوگوں کے ذہن کو سیکولر نہ بنایا جائے ' کیونکہ سیکولر نظام میں ہی مذہبی تعصب ' جنونیت ' انتہاپسندی ' اور فرقہ واریت سے نجات مل سکتی ہے اور جب ادب و فنون لطیفہ مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں گے تو اس وقت ان میں تخلیقی اضافے ہو سکیں گے ' اور ایک نئی توانائی کے ساتھ ثقافت کی تعمیر و تشکیل ہو سکے گی -

روشن خیالی اور دانشور

یورپ میں سترھویں صدی کی سائنسی ایجادات نے زرعی اور صنعتی تبدیلیوں کو پیدا کیا' انسان کی جگہ محنت اور پیچیدہ کاموں کے لئے مشینوں کو استعمال کیا جانے لگا' صنعتی ترقی ہوئی تو سڑکوں' نہروں' اور ذرائع آمد و رفت، کو بہتر بنایا گیا' سمندروں میں نئے تجارتی راستوں کی دریافتیں ہوئیں جن کے ذریعہ سیاح اور تاجر دنیا کے دور دراز ملکوں میں پہنچنے لگے' ان تبدیلیوں نے یورپ کے پرانے نظام جاگیرداری پر شدید ضرب لگائی' اور وہ ان تبدیلیوں کو برداشت نہیں کر سکا- دیہات اور گاؤں میں جب بڑے بڑے زرعی فارم بننا شروع ہوئے تو کسانوں کی بڑی تعداد بے روزگار ہو کر شہروں میں آنے لگی جس کی وجہ سے شہروں میں صنعتی و فنی اور تجارتی سرگرمیاں شروع ہوئیں- جب معاشرہ کا سماجی ڈھانچہ بدلنا شروع ہوا تو مالی' انتظامی' سیاسی' مذہبی اور تعلیمی اصلاحات شروع ہوئیں- اور بورژوا طبقہ پیدا ہوا کہ جس کے پاس مالی وسائل تھے- اس نے تعلیم اور تجارت کے ذریعہ اپنی بورژوا قدروں کو معاشرہ میں رواج دینا شروع کیا-

جب معاشرہ کا طبقاتی ڈھانچہ بدلا اور اس میں معاشی' سیاسی' اور سماجی تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں' تو نئی روایات و اقدار کی ابتدا ہوئی- پرانے ادارے ٹوٹنا شروع ہوئے تو اس وقت معاشرہ میں ایک انتشار و پراگندگی کی کیفیت پیدا ہوئی اور ذہنوں میں بہت سے سوالات پیدا ہونے لگے کہ انسان کیا ہے؟ اس کا معاشرہ میں کیا مقام ہے؟ سماج اور فطرت میں کیا تعلق ہے؟ نظریات کیوں پیدا ہوتے ہیں اور کیوں تبدیل ہوتے ہیں؟ وغیرہ

ان سوالات کا جواب دانشوروں کی جانب سے دیا گیا' یورپ کے دانشور' آرٹسٹ اور سائنسدان جو اب تک دربار اور چرچ کے ماتحت تھے اور آزادی رائے سے محروم تھے' وہ بھی سماجی تبدیلیوں کے بعد ان کے شکنجہ سے آزاد ہوئے اور دربار اور چرچ کے نظریات کو فروغ دینے کے بجائے انھوں نے ایمانداری کے ساتھ آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا' اور ان میں سے اکثر نے پہلی مرتبہ اپنے فن کو بطور پیشہ اختیار کر کے خود کو تمام

پابندیوں سے آزاد کر لیا- چھپائی کی سہولتوں نے انھیں یہ مواقع فراہم کئے کہ وہ اپنے خیالات و نظریات کو آسانی کے ساتھ لوگوں تک پہونچائیں - روشن خیالی کی اس تحریک کو کتب خانوں کے قیام نے فائدہ پہونچایا - کیونکہ کتابیں جو اب تک لوگوں کی پہونچ سے دور ہوا کرتی تھیں ' اس کے ذریعہ ان تک پہونچ گئیں - دانشوروں کی ذہنی نشوونما کافی ہاؤسوں میں ادبی نشستوں اور وہاں ہونے والے بحث و مباحثہ میں ہوئی - اسی عہد میں تمام علوم کو مختصر اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے انسائیکلوپیڈیا ترتیب دئے گئے تاکہ نئے خیالات و نظریات اور معلومات کو عوام تک پہونچایا جائے -

روشن خیالی کی تحریک کی سب سے بڑی خصوصیت سیکولر نظریات کا فروغ ہے یورپی دانشوروں نے قرون وسطیٰ کی تاریخ سے اس کا تجزیہ کیا کہ جب تک علوم و فنون پر چرچ کا غلبہ رہا ' اور علمی ادارے و یونیورسٹیاں ان کے زیر اثر رہیں ' انھوں نے معاشرہ کی تخلیقی ذہنیت اور صلاحیتوں کو کچل کر رکھ دیا ' اور انسانی عقل و فہم کے تمام راستوں کو بند کر کے ان پر پابندیاں عائد کر دیں ' مذہبی عقائد کو جن نظریات سے ذرا بھی خطرہ ہوتا تھا ' انھیں بری طرح سے دبایا جاتا تھا ' علم کا مقصد سماج کی خدمت نہیں بلکہ چرچ کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا ' اس لئے یورپی دانشوروں نے معاشرہ میں ایک ایسے سماجی عمل کی ابتداء کی جس کے ذریعہ مذہبی عقائد کا ذہن و دماغ پر سے غلبہ ختم ہو اور معاشرہ کی زندگی میں مذہبی اثرات کم ہوں - انھوں نے ریاضی اور طبیعاتی علوم کے ذریعہ توہمات کو توڑا ' اور ایسے خیالات کو فروغ دیا کہ جن سے ذہن میں وسعت آئے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چرچ کا غلبہ کم ہوا ' اور اس کی گرفت جو تعلیمی اداروں ' کتابوں کی چھپائی ' اور نظریات و افکار پر تھی وہ کمزور ہوئی ' اور معاشرہ اس گھٹن سے نکل کر آزاد فضا میں آیا ' اور لوگوں کے ذہن سے جب چرچ کا اثر ختم ہوا تو انھوں نے وطن ' ملک ' اور انسانیت کے بارے میں سوچنا شروع کیا -

والٹیر نے خصوصیت سے تاریخ کو سیکولر بنایا ' جس کا نتیجہ ہوا کہ اب تک دنیا کی تاریخ جو عیسائی اور غیر عیسائی اقوام میں تقسیم تھی ' وہ اب سب کے لئے ایک ہو گئی اور غیر عیسائی اقوام کی تاریخ و تمدن سے جو ناواقفیت تھی وہ ختم ہوئی ' اور جب ذہن سے تعصبات

ختم ہو [illegible] ممکن ہوا کہ غیر یورپی اقوام [illegible]
جذبہ تھا کہ جس نے مصر، عراق، ایران، یونان، روم اور ہندوستان کی قدیم تہذیبوں کی دریافت کا عمل شروع کیا۔

جب تجارت اور سیاحت نے دنیا کو سمیٹنا شروع کیا تو یورپی سیاح دور دراز کے ملکوں میں گئے اور وہاں سے لوٹ کر انھوں نے ان ملکوں کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے تو اس سے یہ تاثر ٹوٹا کہ صرف عیسائیت کی وجہ سے دنیا مہذب ہوئی ہے اور یہ کہ صرف پیغمبر دنیا کو اخلاقیات دیتے ہیں، کیونکہ کنفیوشس کی زندگی اور تعلیمات اور چین کے قوانین، اخلاقیات اور تہذیبی روایات نے ان تعصبات کو ختم کر دیا۔ والٹیر نے کہا کہ

"ہمیں دوسری تہذیبوں کو اپنے نقطہ نظر سے نہیں پرکھنا چاہئے"

اس نقطہ نظر اور ذہن نے تاریخ کے مطالعہ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ جرمنی کے ایک مشہور مورخ ہوئے زر نے کہا کہ عیسائیت کی سچائی ہر شخص کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اسے تسلیم کرے، یہ تمام اقوام اور قوانین کے مطابق بھی نہیں ہے۔ ہر مذہب کا اپنا مقصد ہوتا ہے اور اس کی علیحدہ سچائی ہوتی ہے مثلاً سیکسن آزادی کے جذبات عیسائیت کے مطابق نہیں، کیونکہ سیکسن عزت و وقار میں بندھا ہوا ہوتا ہے اور عیسائیت میں اس کی جگہ محبت ہوتی ہے۔ موسیٰ کے احکامات خانہ بدوشوں کے لئے تھے۔ آباد لوگوں کے لئے نہیں۔ اس لئے ہر مذہب کی اپنی علیحدہ سچائی ہوتی ہے۔ اس نقطہ و نظر نے معاشرہ میں قوت برداشت کو پیدا کیا، اور سوچ میں آفاقیت و پھیلاؤ آیا۔

اس کے بعد ایک حقیقت اور سچائی پر زور دینے کے بجائے سائنسی طریقہ کار سے مختلف حقیقتوں کی تلاش شروع ہوئی۔ بنیادی مقصد یہ قرار پایا کہ کس طرح سے فرد کی خوشی اور آزادی کو حاصل کیا جائے۔ دانشوروں نے اس مذہبی نقطہ نظر کی مخالفت کی کہ زوال آدام کے بعد سے انسان مسلسل تکلیف میں مبتلا ہے، انھوں نے اس پر زور دیا کہ انسان

مسلسل آگے کی جانب بڑھ رہا ہے ' وہ غلطیوں سے سیکھ رہا ہے اور نامکمل سے مکمل کی جانب جارہا ہے - ماضی کا تجربہ ہماری امیدوں کو بڑھاتا ہے اور خوف کو کم کرتا ہے - سماج اور ثقافت تاریخی عمل کی پیداوار ہیں اس لئے ان میں تبدیلی کے عناصر موجود ہیں -

انہوں نے اس سوال کا بھی جواب دیا کہ کیا موجودہ نظام فطرت کے مطابق ہے ؟ انہوں نے فطرت کو سماجی برائیوں اور نظام کے خلاف استعمال کیا - تاکہ انسان کے توہمات ' روایات ' اقدار ' اعتقادات ' تقدیر پر اعتبار ' اور طبقاتی نظام ان سب کو غیر فطری کہہ کر ان سے انکار کیا - ہر طبقہ اپنے نظریات کو فطرت کے مطابق بتاتا ہے ' اس طرح سے طاقت ور کی فطرت ہے کہ اپنا تسلط قائم کرے اور کمزور کی فطرت ہے کہ حقوق کے لئے جدوجہد کرے ' دراصل دیکھا جائے تو فطرت اس تمام کش مکش میں غیر جانبدار رہتی ہے - -

روشن خیالی کی تحریک کے دانشوروں نے اظہار رائے اور عمل کی آزادی پر زور دیا ' اور عقلیت کو تمام نظریات کے جانچنے کا معیار بنایا - انہوں نے ریاست اور اس کے اداروں پر تنقید کی اور اس پر زور دیا کہ یہ تنقید ہوتے رہنا چاہئے ' کیونکہ اگر اقتدار چند افراد کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گیا تو اس سے بدعنوانی پیدا ہوگی اور اکثریت اپنے حقوق سے محروم رہے گی - انہوں نے اس کی نشان دہی کی ریاست کا کام کمزور کا دفاع کرنا ہے اور طاقت وروں کو جبر سے روکنا ہے ' اور یہ کہ کوئی معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی اکثریت غریب اور مجبور ہو -

روسو نے معاہدہ عمرانی کے ذریعہ سیاسی نظام پر ایک کاری ضرب لگائی ' اب تک حکمراں مطلق العنان ہوتا تھا اور صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہوا کرتا تھا ' اور جب وہ عوام کو کچھ دیتا تھا تو یہ اس کی مہربانی تھی ' مگر اب روسو کے نظریہ کے تحت حکمراں کی طاقت اس کے اور عوام کے درمیان ایک معاہدہ کے نتیجہ میں تھی اور عوام کو یہ حق تھا کہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں ' اس نے بادشاہ کی حیثیت کو کم کر دیا - اور عوام کی اہمیت کو بڑھایا ' اور انہیں بنیادوں پر جمہوری اقدار اور روایات کا فروغ ہوا '

روشن خیالی کی اس تحریک نے یورپ کو جمود اور گھٹن سے نکالا' اور ان کے گرد جو
عقائد اور فرسودہ روایات کا حصار تھا اسے توڑا' مذہبی سوچ کی جگہ سیکولر اور سائنسی سوچ
کو قائم کیا' اور اسی نے یورپ کی ترقی کی راہوں کو ہموار کیا۔

پاکستانی دانشور اور معاشرہ

پاکستانی معاشرہ اس وقت جس انتشار' افرا تفری' اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اس کے نتیجہ میں پاکستان کے دانشوروں کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں کہ وہ معاشرہ میں ذہنی تبدیلی لے کر آئیں اور خصوصیت سے مذہبی جنونیت' بنیاد پرستی' تعصبات' توہمات اور تنگ نظری کے خلاف جدوجہد کریں اور معاشرہ میں روشن خیالی کی روایات ڈالیں۔

اب تک پاکستانی دانشور روشن خیالی کی روایات کو کیوں نہیں آگے بڑھا سکے؟ اس سوال کا اگر تجزیہ کیا جائے تو کچھ اہم باتیں سامنے آتی ہیں' پاکستان کے معاشرہ میں کہ جہاں خواندگی کی شرح بہت کم ہے اور جہاں کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد بھی کم ہے' ایک ایسے معاشرہ میں کسی لکھنے والے کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ لکھنے کو اپنا پیشہ بنائے اور اس کی آمدنی پر اپنا گزارا کر سکے۔ اس لئے اکثر لکھنے والے۔ لکھنے کو وقتی طور پر استعمال کرتے ہیں' اور روزی کے لئے ملازمتیں کرتے ہیں۔ ملازم ہونے کی حیثیت سے اول تو ان کی آزادی ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس حیثیت میں نہیں ہوتے کہ اپنی رائے کا اظہار کر سکیں' خصوصیت سے ہمارے معاشرہ میں سرکاری اور نجی ملازموں پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندی ہے' اور وہ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ آزادانہ طور پر اپنا تعلق برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے اگر اس کے خیالات ذرا بھی مختلف ہوتے ہیں تو فوراً یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اسے ملازمت سے نکال دیا جائے۔ لہٰذا ملازمت کھونے اور ذریعہ معاش سے محروم ہونے کا خوف ہمیشہ اس کے ذہن پر سوار رہتا ہے اور اسے اس پر مجبور کرتا ہے کہ وہ روایات کو توڑنے کی بات نہ کرے بلکہ انہیں قائم و مضبوط بنانے پر اپنا زور قلم صرف کرے۔

یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ دانشوروں کی علیحدہ اور خود مختار تنظیمیں اور ادارے نہ ہوں' اور جب تک انہیں روزگار کی طرف سے بے فکر نہ کر

دیا جائے اس وقت دانشور بحیثیت مجموعی آزادی سے اپنا کردار ادا کرنے کے قابل نہ ہوں گے - اس قسم کے ادارے دانشوروں کو خود بنانا ہوں گے اور مالی وسائل کے لئے مختلف ذرائع ڈھونڈنا ہوں گے -

دانشوروں کی آزادی اور اظہار پر پابندی کی وجہ خود ان کا طبقاتی کردار ہے اکثر دانشوروں کا تعلق متوسط طبقہ سے ہے' اور اس حیثیت سے استاد' ڈاکٹر' وکیل' یا چھوٹے تاجر ہیں' اور ان کی یہ خواہش ہے کہ وہ اور ان کا خاندان ان سماجی حیثیت کو برقرار رکھیں - اگر وہ سماج کو تبدیل کرنے کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انھیں اپنی مراعات چھوڑ کر عوام میں ملنا ہو گا اور اپنا معیار زندگی بھی گھٹانا ہو گا' اس وجہ سے یہ طبقہ بڑے جوش اور جذبہ کے ساتھ مذہبی او ثقافتی اور سماجی روایات کو برقرار رکھنا چاہتا ہے اور نظام کی تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے -

لہٰذا اس کے بعد دانشوروں کا ایک محدود حصہ باقی بچتا ہے کہ جس کا عوام اور معاشرے سے لگاؤ اور تعلق ہے' اور یہ ایک مقصد کے ساتھ لکھتے ہیں - تاکہ معاشرہ میں بنیادی تبدیلی کو لایا جا سکے' لوگوں میں روشن خیالی کو پیدا کیا جا سکے اور ان میں اس قوت برداشت کو پیدا کیا جا سکے کہ جو دوسروں کے نقطہ نظر کو سن سکیں اور سمجھ سکیں -

دانشور اور تحقیق

جدید دنیا میں دو قسم کی تحقیق ہو رہی ہے' ایک وہ تحقیق کہ جس کا تعلق صرف ماہرین علوم اور دانشوروں سے ہوتا ہے' اور یہ ایک محدود دائرے میں رہتی ہے اس کی زبان اور بیان دونوں مشکل ہوتے ہیں - اور اسے صرف ماہرین کا ایک مخصوص گروہ ہی سمجھ سکتا ہے -

دوسری تحقیق وہ ہوتی ہی کہ جس میں موضوعات کو عام' اور سہل زبان میں لوگوں کے لئے لکھا جاتا ہے' اور اس میں عوام کے بنیادی مسائل سے بحث کی جاتی ہے تاکہ ان

میں ذہنی شعور پیدا ہو اور انھیں اپنی اہمیت کا احساس ہو۔

پاکستان کے دانشوروں کے لئے اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ معاشرے کے بنیادی مسائل پر تحقیق کریں - اور ان موضوعات کو اختیار کریں کہ جن کا تعلق ہمارے مسائل سے ہو، مثلاً ہمارے سائنسدان کا مسئلہ ابھی یہ نہیں کہ خلا میں جہاز کو کیسے بھیجا جائے بلکہ یہ ہے کہ لوگوں کو صاف پانی کیسے مہیا کیا جائے' اس لئے بہ چول سائنس کے موضوعات ہوں یا سماجی علوم ' ان سب میں دانشوروں کو عوام کی سطح پر آکر ان سے متعلق موضوعات پر کام کرنا ہو گا جس کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ان میں شعور اور آگہی پیدا کی جائے' صرف اسی صورت میں ہمارے دانشور معاشرے میں روشن خیالی کی تحریک کو مضبوط کر سکتے ہیں۔

فرانسیسی انقلاب نقطہ ہائے نظر

فرانسیسی انقلاب تاریخ کے ان واقعات میں سے ایک ہے جس نے تاریخی عمل اور دھارے کو موڑدیا اور یورپ پر بالخصوص اور دنیا کے دوسرے ملکوں پر بالعموم اثر انداز ہوا۔ اس وجہ سے یہ انقلاب مورخوں کے لئے ایک اہم موضوع رہا اور اس کا انھوں نے مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا۔ ان میں اہم پہلو یہ تھے کہ کیا فرانسیسی انقلاب روشن خیال عہد کے نظریات کی پیداوار ہے یا یہ فرانس کے استحصالی نظام اور عوام کی غربت و افلاس کے نتیجہ میں پیدا ہوا؟ کیا یہ انقلاب لانے والے متوسط طبقے کے لوگ تھے' یا نچلے طبقوں کے کچلے ہوئے عوام۔ اور یا دیہاتوں کے کسان؟ کیا یہ انقلاب محض ایک حادثہ تھا۔ یا ایک خاموش اور آہستہ عمل' جو کہ ایک خاص مرحلہ پر آکر پھٹ گیا؟ اور یہ کہ یہ انقلاب فرانس ہی میں کیوں آیا' دوسرے یورپی ملکوں میں کہ جہاں فرانس جیسے حالات تھے وہاں کیوں نہیں آیا؟

فرانسیسی انقلاب کی تعبیرو تفسیر کرتے ہوئے کچھ مورخوں نے انقلاب کے عمل کو شخصیتوں سے ملادیا ہے کہ جو ہر مرحلہ پر انقلاب کو ایک نیا رخ دے رہے تھے' اور یہ کہ ان کے نظریات اور عمل نے انقلاب کے عمل کو تیز کیا' مگر کچھ مورخ انقلاب میں شخصیتوں کے کردار کو اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ وہ ان قوانین کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں جو کہ انقلاب کے پیچھے سرگرم عمل تھے۔

ایک نقطہ نظریہ ہے کہ انقلاب نے ہر چیز کو تہس نہس نہیں کیا' اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ انقلاب ہر قدیم چیز کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ تو یہ سمجھنا سادگی ہے۔ معاشروں کا تعلق ماضی سے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹ جاتا ہے' ماضی زمانہ حال میں اس قدر مضبوطی سے پیوست ہوتی ہے کہ اس کی جڑوں کو آسانی سے نکال کر باہر نہیں پھینکا جا سکتا ہے۔ روشن خیالی کے دور میں اس پر زور دیا گیا تھا کہ ماضی سے مکمل طور پر چھٹکارا پایا جائے۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ صرف اسی صورت میں ایک نئے ذہن کی ابتداء ہو سکے گی' اور ہر چیز کو نئے سرے

سے شروع کیا جاسکے گا- یہ نظریہ انیسویں صدی تک مقبول رہا- مگر بعد میں یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر معاشرہ اپنی ماضی کا قیدی ہوتا ہے اور اس سے پوری طرح نجات نہیں پا سکتا ہے-

فرانسیسی انقلاب کے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ اس نے ماضی کی بہت سی روایات اور اداروں کو ختم کر دیا- مگر اس کے باوجود انقلاب ماضی کے تعلق کو ختم نہیں کر سکا اور بہت سے رشتے باقی رہے-

فرانسیسی انقلاب کیوں آیا؟ اس کی وجوہات پر کئی فرانسیسی مورخوں نے لکھا ہے اور ہر ایک نے ایک نیا نقطہ نظر پیش کیا ہے- ایک فرانسیسی مورخ مشلے نے انقلاب کی اہم وجوہات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ لوئی چہاردھم نے فرانس کو خاندانی سازشوں پر قربان کر دیا' اسے ملک سے زیادہ اپنے خاندان کا مفاد عزیز تھا- اس لئے اس کی ساری توجہ ملکی اور عوامی مفاد کے بجائے اپنے خاندان کی عظمت کو برقرار رکھنے اور خود کے اقتدار کو قائم رکھنے میں صرف ہوئی- حکمران طبقوں کی بدعنوانی' لالچ اور خود غرضی نے حکومت کی جڑوں کو کمزور کر دیا اور ملک کو اس جگہ پر پہونچا دیا کہ جہاں سوائے انقلاب کے اور کوئی راستہ نہیں تھا-

لوئی بلاں نے فرانسیسی انقلاب پر جو کتاب لکھی وہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی- وہ انقلاب کی تاریخ میں تین عناصر کو متصادم دیکھتا ہے-

۱- اتھارٹی جس کا مطلب ہے جبر' غیر مساوی سلوک' اور روایات کے لئے متعصبانہ احترام-

۲- انفرادیت حکومت اور زندگی کے معاملات میں آزادی

۳- اخوت معاشرہ انسانی جسم کی طرح ہے اور اس کے عناصر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اس لئے حکومت و عوام دونوں لازم و ملزوم ہیں- حکومت جب ہی کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ رعیت اس کی حامی ہو-

جب تک ان تین عناصر میں توازن ہوتا ہے معاشرہ برابر آگے کی جانب بڑھتا رہتا ہے' مگر جب توازن بگڑ جاتا ہے تو اس صورت میں معاشرہ میں تبدیلی آتی ہے' اور یہ تبدیلی انقلاب کی صورت میں رونما ہوتی ہے-

فرانس میں انقلاب سے پہلے انفرادیت کا عروج ہوا، جس کے تحت بورژوا طبقہ ابھرا اور اس نے ترقی کی مگر جب اس کے مقابلہ میں اشرافیہ نے جبر اور غیر مساوی سلوک پر زور دیا اور طبقہ امراء نے دوسرے تمام طبقوں کو حقوق سے محروم کر کے صرف اپنی مراعات رکھنے پر زور دیا۔ تو اس کے نتیجہ میں اخوت کا جذبہ کمزور ہوتا چلا گیا، حکومت و رعیت میں خلیج بڑھتی چلی گئی اور اس طرح معاشرہ کا توازن بگڑ گیا جس کے نتیجہ میں انقلاب کی راہیں ہموار ہوئیں۔"

بیبر لافرنے فرانسیسی انقلاب کی وجوہات میں کیتھولک چرچ کے رویہ اور جبر کو مورد الزام ٹھہرایا ہے کہ جس کے رد عمل میں دانشوروں نے اسکے خلاف عملی تحریک شروع کی۔ ۱۷۵۰ء کی دہائی میں روشن خیال ادیبوں کی تحریروں نے مذہب توہم پرستی اور سیاسی جبر کے خلاف آواز اٹھائی اور انہوں نے اپنی تحریروں کو معاشرے کے مسائل سے ہم آہنگ کر کے لوگوں کو ذہنی و فکری غذا فراہم کی۔ اگرچہ حکومت نے اس ذہنی تحریک کو دبا دیا، مگر ان خیالات میں جو زندگی اور توانائی تھی وہ کھو کھلی نہیں ہو سکی اور انہوں نے لوگوں میں جو شعور پیدا کیا وہ آگے چل کر انقلاب لانے اور اس کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوا۔

ایک اور فرانسیسی مورخ تین (Tain) نے فرانسیسی انقلاب کا مطالعہ رجعت پرست نقطہ نظر سے کیا۔ اس کے نزدیک معاشرہ میں روایات و ادارے اچانک نہیں بنتے، اور نہ ہی یہ شخصیات کی خواہشات کے نتیجہ میں وجود میں آتے ہیں بلکہ یہ تاریخی عمل کی پیداوار ہوتے ہیں، اس لئے وقت کے ساتھ ارتقاء پذیر ہو کر یہ قومی کردار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ایک عام آدمی صرف اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل چاہتا ہے۔ وہ ایک لحاظ سے وحشی جانور کی مانند ہوتا ہے اس لئے اس کی روزمرہ کی زندگی میں جانوروں والی فطرت کو روکنا ضروری ہوتا ہے اور یہ کام صرف ریاست کی طاقت کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ فرانس میں انقلاب اس وجہ سے آیا کہ ریاست انسان کی فطرت کو قابو میں رکھنے میں ناکام ہو گئی۔ اور جب انقلاب آیا تو اس نے قومی اداروں اور روایات کو توڑ کر فرانس کو تہذیبی

اور ثقافتی طور پر ایک بڑے خزانہ سے محروم کر دیا۔

ژاں ژورے نے انقلاب کو مارکسی نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ انقلاب کی وجوہات کو بیان کرتے ہوئے وہ قدیم حکومت' بادشاہ کی کمزوریاں' نااہل و کاہل امراء کی عیاشیوں کا ذکر کرتا ہے کہ جنھوں نے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقہ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ اور ان رکاوٹوں کو ہٹانے کی خواہش نے انقلاب کی پیدا کیا۔ اسکے نزدیک انقلاب چند دانشوروں کی وجہ سے نہیں آیا بلکہ اس کے پیچھے معاشی عوامل تھے جن میں صنعتی و تجارتی سرگرمیاں' فرانس کی بندرگاہوں کی بین الاقوامی تجارت میں اہمیت' نو آبادیات پر قبضہ اور ان کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ' ان عوامل نے بورژوا طبقہ کو آگے بڑھایا' اور انہوں ے علمی و فکری سطح پر سماجی و معاشی مسائل میں دلچسپی لے کر شعور پیدا کیا۔

ان مورخوں نے فرانسیسی انقلاب کا جو مطالعہ کیا ہے وہ تاریخ میں آنے والے انقلابوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ انقلاب اس وقت آتا ہے جب ترقی اور آگے بڑھنے کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں' اس وقت تشدد کے ذریعہ تبدیلی لائی جاتی ہے اور رد عمل کے طور پر ہر قدیم چیز کو تباہ کر دیا جاتا ہے۔

تاریخ کے بدلتے نظریات

ڈاکٹر مبارک علی

نامور تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی
کی تاریخ پر مستند کتابیں

مغل دربار	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ کے بدلتے نظریات	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ اور سیاست	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ ٹھگ اور ڈاکو	ڈاکٹر مبارک علی
نجی زندگی کی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ اور دانشور	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ کھانا اور کھانے کے آداب	ڈاکٹر مبارک علی
سندھ خاموشی کی آواز	ڈاکٹر مبارک علی
آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان	ڈاکٹر مبارک علی
برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ	ڈاکٹر مبارک علی
علماء اور سیاست	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ اور عورت	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ اور فلسفہ تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ کی روشنی	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ شناسی	ڈاکٹر مبارک علی
شاہی محل	ڈاکٹر مبارک علی
المیہ تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی
اچھوت لوگوں کا ادب	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ کے بدلتے نظریات	ڈاکٹر مبارک علی
جاگیرداری	ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس

۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور